رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

سٹار پاکٹ سیریز
: ۲۸۳ :

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزمِ سخن
کچھ فراقؔ اپنی سُناؤ کچھ زمانے کی کہو

نغمہ نما

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

فراق گورکھپوری

ناشر: سٹار پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لیمیٹڈ
۵/۴ بی۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

نیا اضافہ شدہ ایڈیشن: ۱۹۷۱ء

قیمت: دو روپے

مطبع: جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

NAGMA-NUMA : FIRAQ GORAKHPURI 2/-

میری شاعری

میری شاعری میرے شاعر ہونے سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ابھی میں بچہ ہی تھا کہ میری ماں نے اور گھر کے اور لوگوں نے دیکھا کہ میں بدصورت عورت یا بدصورت آدمی کی گود میں نہیں جاتا تھا۔ مجھے صرف جسم میں نہیں بلکہ لباس میں بھی طور طریقوں۔ چال ڈھال میں آدمیوں کی ہر بات میں پھوہڑپن اور بدھاپن سخت ناپسند تھا۔ گھر کی بناوٹ۔ گھر کے سامان چیزوں کی صورت اور ترتیب ہر چیز میں، میں نفاست اور سگھڑاپا چاہتا تھا۔ ہم عمروں اور ہم جماعتوں یا ساتھیوں۔ رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کے مقامات سے مجھے شدید محبت تھی۔ پیڑ اور باغ پودے لہلہاتے کھیت، سبزہ زار غرض کہ زمین اور آسمان کے تمام مناظر مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ انسانی زندگی کے واقعات اور مناظرِ قدرت کی چھوٹی چھوٹی جزویات میرے دل میں ڈوب جایا کرتے تھے اور میں ان میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ مجھے یہ دنیا ایک معجزہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ خاموش اثرات اور احساسات میرے خون میں گوشت پوست میں اور میرے دل و دماغ میں حل ہو کر رہ گئے تھے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو نیا ہندوستان جلوہ گر ہو رہا تھا۔
مجھے اس بات کی تلاش ہوئی کہ ہندوستان کے کلچر کے حقیقی اور قیمتی
عناصر کیا ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سچائی یا حقیقت ایمان لانے یا مان
لینے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ہر شخص کے لئے اور ہر تہذیب کے لئے نجی طور
پر تلاش کر کے حاصل کرنے کی چیزیں ہیں۔ میں رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا
کہ مادہ یا مٹی کو سب سے قیمتی خصوصیت اس کی پاکیزگی ہے یا اس کی
दिव्यता ہے۔ حیات و کائنات اسی दिव्यता کی لیلا یا مظاہرہ ہے اور
اسی احساس کو میں ہندو کلچر کی سب سے قیمتی دین سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ
قیمتی دین اس لئے نہیں ہیں کہ جو ہندو ہیں یا اپنے آپ کو ہندو سمجھتے ہیں
وہ غیر ہندوؤں کے سامنے ڈینگ ماریں یا اپنی برتری جتاتے پھریں یا دنیا
بھر سے اپنے کو الگ تھلگ سمجھیں۔ سچا کلچر وہی ہے جو پوری انسانیت
کے عام آدرشوں کا حامل ہو۔ البتہ یہ آدرش تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ کچھ نہیں
اوپری ہیں کچھ نہیں گہری ہیں۔ ان گہرائیوں کا احساس ہی حقیقی معنوں میں
کلچر ہے۔ جیسے جیسے ان گہرائیوں کا احساس ہوتا جاتا ہے، ہمارے
محسوسات بھی گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ذرہ ذرہ اور قطرہ
قطرہ اپنی جگہ ایک دنیا بن جاتے ہیں اور معنویت کے ایک دفتر بن جاتے
ہیں۔ اس معنویت کو ویدوں، اپنشدوں، سنسکرت اور ہندوستان
کی دوسری زبانوں کی ادبیات، یہاں تک کہ ان پڑھ ہندوستانیوں کی
زندگی کے داخلی روایات کی نشاندہی کرتے رہے ہیں۔ ہماری گھریلو
زندگی، ہماری کئی رسمیات اور تہوار، ہمارا سنگیت، ہماری دوسری کلائیں
یا فنون، دنیا کی दिव्यता کی طرف اشارے کرتے رہے ہیں۔ میں

نے اپنی شاعری میں اسی پاکیزگی اور اس [illegible] کی طرف اشارے کئے ہیں۔ انہیں محسوسات کو اپنے ہندو مسلمان اور دیگر ہم وطنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میری شاعری میں پریم یا محبت اور زندگی کے دوسرے تجربات یہی چاہتے رہے ہیں کہ وہ کرشن لیلا بن جائے۔

ہندوستان ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد اپنی سماجی زندگی کی کئی خطرناک کمزوریوں کے کارن گراوٹ کے گڈھے میں گر گیا۔ پجاریوں اور دوسروں کو دبا کر رکھنے والوں نے یہی نہیں کیا کہ پورے دیس کی ترقی رک جائے بلکہ یہ بھی کیا کہ خود کی ترقی رک گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب تاریخی قوتوں نے مسلمانوں کو یہاں بھیجا۔ لیکن مسلمان جہاں سیکڑوں طریقوں سے ہمیں نئی زندگی دے سکتے تھے، وہاں وہ ہندو کلچر کے بہت سے قیمتی عناصر سے نامانوس تھے۔ ان عناصر کو انگڑائی لے کر جاگ اٹھنے میں وقت کی ضرورت تھی اور ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اتنا ضرور کیا کہ ایسے لگ بھگ ایک ہزار برس پہلے ہم جو نئی زندگی اور شہری زندگی کو پھر سے جنم دینے کی صلاحیت کو کھو بیٹھے تھے، اس صلاحیت کو پھر سے ہندوستان میں اور ہندوستانیوں میں جگا دیا۔ اردو زبان اور اردو شاعری اسی صلاحیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اردو زبان ہندی کی وہ شکل ہے جسے ہم شہریت یافتہ کہہ سکتے ہیں یا شہری زبان کہہ سکتے ہیں۔ سنسکرت بھی دیہاتی زبان ہی تھی۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی داستان بھی دیہقانیت سے نکل کر شہریت میں قدم رکھنے کی داستان ہے۔ میرے لئے اردو زبان کو اپنانا نئے ہندوستان کو اپنانا تھا۔ ہندوستان کی نئی تاریخ اور نئی زندگی کو اپنانا تھا۔ نئے

ہندوستان کی پوری زندگی وہی لب ولہجہ، وہی بولی اور وہی چیتنا
اختیار کرسکتی ہے، جس کی مثال اردو زبان ہے۔ میں نے صرف اتنا
کیا کہ اردو زبان کے سانچے کو اور گہرا کرنے کی بھی کوشش کی تاکہ اس
میں وہ تمام رس جس سمائے جس کے راستے رکے ہوئے تھے۔ میری
کویتاؤں کا یہ ~~[illegible]~~ شائد اس طرف کچھ اشارہ کر سکے۔

[illegible]

رگھوپتی سہائے فراقؔ

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اک شرحِ حیات ہو گئی ہے

جب دل کی وفات ہو گئی ہے
ہر چیز کی رات ہو گئی ہے

غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو
کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے

مدّت سے خبر ملی نہ دل کی
شاید کوئی بات ہو گئی ہے

جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری
تصویرِ حیات ہو گئی ہے

اب ہو دیکھئے مجھے کہاں صبح
ان زلفوں میں رات ہو گئی ہے

دل میں تجھ سے تھی جو شکایت
اب غم کے نکات ہو گئی ہے

اقرارِ گناہِ عشق سن لو
مجھ سے اک بات ہو گئی ہے

جو چیز بھی مجھکو ہاتھ آئی
تیری سوغات ہو گئی ہے

کیا جانیے موت پہلے کیا تھی
اب مری حیات ہو گئی ہے

گھٹتے گھٹتے تری عنایت
مری اوقات ہو گئی ہے

اس چشمِ سیہ کی یاد یکسر
شامِ ظلمات ہو گئی ہے

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

چلتی ہوئی بازیٔ محبت
کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے

مٹنے لگیں زندگی کی قدریں
جب غم سے نجات ہو گئی ہے

وہ چاہیں تو وقت بھی بدل جائے
جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے

دنیا ہے کتنی بے ٹھکانہ
عاشق کی برات ہو گئی ہے

پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی
اب برق صفات ہو گئی ہے

جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے
اک برگِ نبات ہو گئی ہے

اِکّا دکّا صدائے زنجیر
زنداں میں رات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراقؔ اس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی
ایک پیغامِ زندگانی بھی عاشقی مرگِ ناگہانی بھی
اِس ادا کا تری جواب نہیں مہربانی بھی سرگرانی بھی
دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی
منصبِ دل خوشی لٹانا ہے غمِ پنہاں کی پاسبانی بھی
دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب زندگی آگ بھی ہے پانی بھی
شاد کاموں کو یہ نہیں توفیق دلِ غمگیں کی شادمانی بھی
لاکھ حسنِ یقیں سے بڑھ کر ہے ان نگاہوں کی بدگمانی بھی
تنگنائے دلِ ملول میں ہے بحرِ ہستی کی بیکرانی بھی
عشقِ ناکام کی ہے پرچھائیں شادمانی بھی کامرانی بھی
دیکھ دل کے نگارخانے میں زخمِ پنہاں کی ہے نشانی بھی
خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی؟ کچھ سنوں میں تری زبانی بھی
آئے تاریخِ عشق میں سو بار موت کے دورِ درمیانی بھی
اپنی معصومیوں کے پردے میں ہوگئی وہ نظر سیانی بھی
دن کو سورج مکھی ہے وہ نو گل رات کو ہے وہ رات رانی بھی

دل بدنام تیرے بارے میں
لوگ کہتے ہیں اک کہانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دنیا
کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دل کو آداب بندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

جور کم کم کا شکریہ بس ہے
آپ کی اتنی مہربانی بھی

دل میں اک ہوک بھی اٹھی اے دوست
یاد آئی تری جوانی بھی

سر سے پا تک سپردگی کی ادا
ایک انداز ترکمانی بھی

پاس رہنا کسی کا رات کی رات
میہمانی بھی میزبانی بھی

ہو نہ عکس جبین ناز کہ ہے
دل میں اک نور کہکشانی بھی

زندگی عین دید یار فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی

بے ٹھکانے ہے دلِ غمگیں ٹھکانے کی کہو

شامِ ہجراں دوستو اس کے آنے کی کہو

ہاں نہ پوچھو اک گرفتارِ قفس کی زندگی

ہم صفیرانِ چمن کچھ آشیانے کی کہو

اڑ گیا ہے منزلِ دشوار میں غم کا سمند

گیسوئے پُر پیچ و خم کے تازیانے کی کہو

بات بنتی اور باتوں سے نظر آتی نہیں

اس نگاہ ناز کے باتیں بنانے کی کہو

داستاں وہ تھی جسے دل بجھتے بجھتے کہہ گیا

شمعِ بزمِ زندگی کے جھلملانے کی کہو

کچھ دلِ مرحوم کی باتیں کرو اے اہلِ غم

جس سے ویرانے تھے آباد اس دِوانے کی کہو

داستانِ زندگی بھی کس قدر دلچسپ ہے

جو ازل سے چھڑ گیا ہے اس فسانے کی کہو

یہ فسون نیم شب یہ خواب ساماں خامشی
سامریٔ فن آنکھ کے جادو جگانے کی کہو

کوئی کیا کھائیگا یوں سچّی قسم، جھوٹی قسم
اس نگاہ ناز کے سوگند کھانے کی کہو

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزم سخن
کچھ فراقؔ اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے — ہر بزم کی جان ہو گئی ہے
آنکھیں پڑتی ہیں میکدوں کی — وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے
آئینہ دکھا دیا یہ کس نے — دنیا حیران ہو گئی ہے
اس نرگسِ ناز میں تھی جو بات — شاعر کی زبان ہو گئی ہے
اب تو تری ہر نگاہ کافر — ایمان کی جان ہو گئی ہے
ترغیبِ گناہ لحظہ لحظہ — اب رات جوان ہو گئی ہے
توفیقِ نظر سے مشکل زیست — کتنی آسان ہو گئی ہے
تصویرِ بشر ہے نقشِ آفاق — فطرتِ انسان ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اِک کرن تھی — اب اک جہان ہو گئی ہے
سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر — صحرا کی اذان ہو گئی ہے
اے موت بشر کی زندگی آج — تیرا احسان ہو گئی ہے
کچھ اب تو اماں ہو کہ دنیا — کتنی ہلکان ہو گئی ہے
یہ کس کی پڑیں غلط نگاہیں — ہستی بہتان ہو گئی ہے
انسان کو خریدتا ہے انسان — دنیا بھی دکان ہو گئی ہے
اکثر شبِ ہجر دوست کی یاد — تنہائی کی جان ہو گئی ہے

شرکت تری بزمِ قصہ گو میں　　افسانے کی جان ہو گئی ہے
جو آج مری زبان تھی۔ کل　　دنیا کی زبان ہو گئی ہے
اک سانحہ رجہاں ہے وہ آنکھ　　جس دن سے جوان ہو گئی ہے
رعنائیِ قامت دل آزار　　میرا ارمان ہو گئی ہے
دل میں اک واردات پنہاں　　بے سان و گمان ہو گئی ہے
سنتا ہوں قضارِ قہرماں بھی　　اب تو رحمان ہو گئی ہے
واعظ مجھے کیا خدا سے　　میرا ایمان ہو گئی ہے
میری تو یہ کائناتِ غم بھی　　جان و ایمان ہو گئی ہے
میری ہر بات آدمی کی　　عظمت کا نشان ہو گئی ہے
جو شوخ نظر تھی دشمنِ جاں　　وہ جان کی جان ہو گئی ہے

ہر بیت فراقؔ! اس غزل کی
ابرو کی کمان ہو گئی ہے

مثلِ فقیر بے نوا پھرتے ہیں جن کو ہم لئے

ہاں انہی جھولیوں میں ہیں راز تونگری کے بھی

سر بھی جھکا چکا ہے عشق حسن کے پائے ناز پر

ناز اٹھا چکا ہے حسن عشق کی خودسری کے بھی

رات تری نگاہِ ناز کتنے فسانے کہہ گئی

غمزۂ کافری کے بھی عشوۂ دلبری کے بھی

شعلے اٹھے زمین کے دیکھ کرشمے اے نگاہ

اِس کے خرام ناز کے فتنۂ سرسری کے بھی

پڑھ کبھی آیتِ شفق قلب و نظر کا واسطہ

جلوہ رنگ رنگ ہیں، رنگ پیمبری کے بھی

چھیڑ دیا غزل میں آج میں نے وہ نغمۂ زمیں

اٹھ گئے گھونگھٹ اے فراق زہرہ و مشتری کے بھی

زمیں بدلی، فلک بدلا، مذاقِ زندگی بدلا
تمدّن کے قدیم اقدار بدلے آدمی بدلا

خدا و اہرمن بدلے وہ ایمانِ دوئی بدلا
حدودِ خیر و شر بدلے مذاقِ کافری بدلا

نئے انساں کا جب دورِ خود آگاہی بدلا
رموزِ بیخودی بدلے تقاضائے خودی بدلا

بدلتے جا رہے ہیں ہم بھی دنیا کو بدلتے ہیں
نہیں بدلی ابھی جو نیا ہے تو دنیا کو ابھی بدلا

نئی منزل کے میرِ کارواں بھی اور ہوتے ہیں
پرانے خضرِ رہ بدلے وہ طرزِ رہبری بدلا

کبھی سوچا بھی ہے اے نظمِ کہنہ کے خداوندو
تمہارا حشر کیا ہوگا جو یہ عالم کبھی بدلا

ادھر پچھلے سے اہلِ مال و زر پر رات بھاری ہے
اُدھر بیداریٔ جمہور کا انداز بھی بدلا

زہے سوزِ غمِ آدم خوشا سازِ دلِ آدم
اسی اک شمع کی لو نے جہانِ تیرگی بدلا

نئے منصور ہیں صدیوں پرانے شیخ و قاضی ہیں
نہ فتوے کفر کے بدلے نہ عذرِ داری بدلا

بتائے تو بتائے اس کو تیری شوخیٔ پنہاں
تری چشمِ توجہ ہے کہ طرزِ بےرخی بدلا

بہ فیضِ آدمِ خاکی زمیں سونا اگلتی ہے
اسی ذرّے نے دورِ مہر و ماہ و مشتری بدلا

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آکے خوابِ زندگی بدلا

فراقؔ ہمنوائے میرؔ و غالبؔ اب نئے نغمے
وہ بزمِ زندگی بدلی، وہ رنگِ شاعری بدلا

یہ صباحت کی ضو مہ چکاں مہ چکاں — یہ پسینے کی رو کہکشاں کہکشاں

عشق تھا ایک دن داستاں داستاں — آج کیوں ہے وہی بے زباں بے زباں

دل کو پایا نہیں منزلوں منزلوں — ہم پکار آئے ہیں کارواں کارواں

عشق بھی شادماں شادماں ان دنوں — حسن بھی ان دنوں مہرباں مہرباں

ہے ترا حسنِ دلکش سراپا سوال — ہے تری ہر ادا چیستاں چیستاں

دم بدم شبنم و شعلہ کی یہ لویں — سر سے پا تک بدن گلستاں گلستاں

بیٹھنا ناز سے انجمن انجمن — دیکھنا ناز سے داستاں داستاں

مہکی مہکی فضا خوشبوئے زلف سے — پنکھڑی ہونٹ کی گلفشاں گلفشاں

جس کے سائے میں اک زندگی کٹ گئی — عمرِ زلفِ رسا جاوداں جاوداں

لے اڑی ہے مجھے بوئے زلفِ سیہ — یہ کھلی چاندنی بوستاں بوستاں

آج سنگم سراسر جو عشق ہے — ایک دریائے غم بیکراں بیکراں

جس طرف جائیے مطلعِ نور نور — جس طرف جائیے مہوشاں مہوشاں

نور زمیں سے مجھے آ رہی ہے تری — تجھ کو کیوں ڈھونڈیے آسماں آسماں

سچ بتا مجھ کو کیا یونہی کٹ جائیگی — زندگی عشق کی رائیگاں رائیگاں

روپ کی چاندنی سوزِ دل سوزِ دل — موجِ گنگ و جمن سازِ جاں سازِ جاں

عہد و پیماں کوئی حسن بھی کیا کرے — عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں

جیسے کونین کے دل پہ ہو بوجھ سا ؛ عشق سے حسن ہے سرگراں سرگراں

کیوں فضاؤں کی آنکھوں میں تھے اشک سے ؛ وہ ستارے ہیں جب شادماں شادماں

لب پہ آئی نہ وہ بات ہی ہم نشیں ؛ آئے کیا کیا سخن درمیاں درمیاں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ڈھونڈ لینگے تجھے ؛ گو نشاں ہے ترا بے نشاں بے نشاں

میرے دارالاماں اے حریمِ نگار ؛ ہم پھریں کیا یونہی بے اماں بے اماں

یوں گھُلے گا گھُلے گا ترے عشق میں ؛ رہ گیا عشق اب استخواں استخواں

ہم کو سننا بہرِ حال، تیری خبر ؛ ماجرا ماجرا داستاں داستاں

اس کے تیور پہ قرباں لطف و کرم ؛ مہرباں مہرباں قہرماں قہرماں

جی میں آتا ہے تجھ کو پکارا کروں ؛ رہ گزر رہ گزر آستاں آستاں

یاد آنے لگیں پھر ادائیں تری ؛ دل نشیں دل نشیں جانستاں جانستاں

کیوں ترے غم کی چنگاریاں ہو گئیں ؛ سوزِ دل سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ جاں

ساتھ ہے رات کی رات وہ رشکِ مہ ؛ میزباں میزباں، میہماں میہماں

عشق کی زندگی بھی غرض کٹ گئی ؛ غمزدہ غمزدہ شادماں شادماں

اب پڑے اب پڑے اسکے ماتھے پہ بل ؛ الحذر الحذر الاماں الاماں

عشق خود اپنی تعریف یوں کر گیا ؛ اہرمن اہرمن، ایزداں ایزداں

کیف و مستی ہیں امکاں در امکاں فراق ؛ چاندنی ہے ابھی نوجواں نوجواں

زہے آب و گِل کی یہ کیمیا ہے چمن کہ معجزۂ نمو
نہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ، وہی خار و خس وہی رنگ و بو

۱

مِل گیا تجھ کو جمالِ رُخِ رنگیں کا چمن
دلِ سوزاں کا یہ تپتا ہوا بن مجھ کو دیا

تیرے بطلان تھے لائے جو مجھے حق کی طرف
تو نے ایمان مرا شیخِ زمن مجھ کو دیا

میرے دل سے مرا ہر شعر گرا اٹھا تو نے
عشوۂ نازِ نگہِ سامری فن مجھ کو دیا

نعرۂ حق نے کیا مرتبۂ عشق بلند
منصبِ جلوہ دہِ دار و رسن مجھ کو دیا

دستِ قدرت نے بس اک پیکرِ خاکی جس میں
سحرِ نو کی تھی اک خوابیدہ کرن مجھ کو دیا

ختم ہے مجھ پہ غزل گوئیِ دورِ حاضر
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

شاعرِ عصر کی تقدیر نہ کچھ پوچھ فراق
جو کہیں کا بھی نہ رکھے گا وہ فن مجھ کو دیا

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی، وائے نادانی!
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

حیاتِ عشق کا اک اک نفس جامِ شہادت ہے
وہ جانِ نازبرداراں کوئی آسان لیتے ہیں

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوانِ دگر وہ مان لیتے ہیں

تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

اب اس کو کفر مانیں یا بلندی نظر جانیں
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگند کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں

رفیقِ زندگی تھی، اب انیسِ وقتِ آخر ہے
ترا اے موت، ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

زمانہ واردات قلب سننے کو ترستا ہے
اِسی سے تو سرآنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں، کبھی پہچان لیتے ہیں

بطرزِ مصحفی

بزمِ ساقی سے اٹھا ہے کوئی یوں رات رہے
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

ڈال کر سمتِ وطن ایک اچٹتی سی نگاہ
ہم سوئے دشتِ جنوں لے کے ترا نام چلے

اکثر اس عالمِ بے نام کی یاد آتی ہے
جس سے مِل جاتے ہیں دنیائے محبت کے سرے

اُف حجاباتِ دو عالم کہ پہنچتے نہیں ہاتھ!
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کاروبارِ دلِ عشاق عجب دھندا ہے
جس قدر فائدہ ہو، اتنے ہی گھاٹے میں رہے

کسی گونگے کا ہے سپنا تو سبھا بہروں کی
عشق وہ قصّہ ہے جسے کون کہے کون سُنے

اِس شہادت گہِ ہستی میں جو ڈر ڈر کے جئیں
زندگی دور رہی، موت بھی پلّے نہ پڑے

اِس نئے دورِ محبّت کے تقاضے ہیں کچھ اور
کیوں کوئی ہوش گہِ عشق میں دیوانے بنے

چشمِ حیراں نے طلسماتِ جہاں دیکھ لیا
آج کیا کیا تری منظروں نے دئے ہیں دھوکے

داستانِ عشق کی دوہرا گئی تاروں بھری رات
کتنی یادوں کے چراغ آج جلے اور بجھے

نہ ملی پر نہ ملی کفر کی منزل اے وائے
خود کو کرتے رہے گمراہ خدا کے بندے

یہی رندوں کی دعا ہے سرِ میخانہ، ترا
ساقیا جام چلے، کام چلے، نام چلے

موجزن کوثر و تسنیم تری زلفوں میں
جنّتیں مجھ کو ملی ہیں ترے قدموں کے تلے

دولت درد بڑی چیز ہے اے عشق پڑا
قرعۂ فال ترے نام خدا جس کو دے

غم تصویر کبھی دیکھا ہے قدِ رعنا کو
کچھ وہ پلکوں میں نمی، اسر و لفنی، بال کھلے

ارجن و رستم و چنگیز کی ہمّت نہ پڑی
کام وہ عشق نے انجام دیئے زندہ رہے

مجھ سے بالشتئے بڑھ جائیں گے اللہ رے زعم
کس ہمالہ کو یہ سر کرنے چلے ہیں بونے

کون کہتا ہے ہر اک سے نہ ملے رات تری
لگّہ ناز مری سمت بھی گا ہے گا ہے

ہم تو یہ کہتے ہیں گو روتی ہے دنیا ان کو
مر گئے جو ترے بیمار فراق اچھّے رہے

عمر آوارگیٔ عشق میں جب ختم ہوئی
جا کے اس وقت کھُلا ہم کہیں آئے نہ گئے

اف وہ اک بات جسے کہہ نہ سکوں تیرے حضور
آہ، وہ ایک قسم مجھ سے جو کھانے نہ بنے

دیکھنے کی ہے یہ مجبوریٔ عشقِ نادم
کس طرح اپنے پسینے میں کوئی ڈوب مرے

اس نے کی پرسشِ حالات تو منھ پھیر لیا
دلِ غمگیں کے یہ انداز، خدا خیر کرے

آہ اُن جلوؤں کے ہوتے ہوئے قائم ہیں حواس

ہم تری انجمنِ ناز کے قابل نہ رہے

دوست کی یاد میں رونے کے تم اوقات فراق

مجھ سے جو تم پوچھتے ہو، رات گئے رات رہے

تو ہے سر بسر کوئی داستاں، ہے عجیب عالمِ انجمن

یہ نگاہِ نازِ زباں زباں، یہ سکوتِ نازِ سخن سخن

یہ شعورِ حسنِ عشق افگنی، یہ ادائے نرگسِ پُر فتن

کہ پلا پلا کے لنڈھا بھی دے، یہ تری نگاہِ پیالہ زن

تری قربتیں بھی ہیں دوریاں، یہ کرشمۂ کششِ بدن

چہ قیامتے کہ نمی رسی، زکنارِ من بہ کنارِ من[1]

---

[1] ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما ٭ چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنارِ ما بہ کنارِ ما
(بیدلؔ)

نہ زیادہ ظرف سے مے نہ کم کہ ہیں ہاتھ اسکے چچے تلے
ہے وہی آنکھ ضامنِ ہوش بھی، وہی آنکھ ساقیِ انجمن

مرے سینے میں ہے وہ روشنی کہ نہ عمر جس کی بتا سکیں
یہیں جلوے دورِ جدید کے، یہیں پرتوِ عہدِ کہن

وہ تمام روئے نگار ہے وہ تمام بوس و کنار ہے
وہ ہے چہرہ چہرہ جو دیکھئے وہ ہے چوسئے تو دہن دہن

نہ خیالِ محفلِ دوستاں کسی اجنبی کا ہے یہ بیاں
وہ جہاں نہ سمجھیں مری زباں، وہی قسمتوں سے ملا وطن

وہ نظر نظر کی فسوں گری وہ سکوت کی بھی سخنوری
تری آنکھ جادوئے سامری ترے لب فسانۂ نل دمن

وہ گناہِ آدمِ اولیں کہ ہے مستیوں کا وہی امیں
ہیں بشر کے خون میں آج بھی کئی جرعہ ہائے مئے عدن

بہ کمالِ جذبِ دلِ تپاں کبھی بدلے گردشِ آسماں
کوئی صبحِ روئے چمن چمن، کوئی شامِ زلفِ شکن شکن

یہ بھی اک بہانہ تھا کھانے کا تری شوخ کج کلاہیوں کی قسم
سرِ شاخسار دکھا گئے، کئی بار غنچے جو بانکپن

یہ تبسمِ لبِ نازنیں، وہ بہارِ پیکرِ دل نشیں
وہی ادھ کھلی سی کلی کلی، وہی تازگی چمن چمن
کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکنِ آہواں ہے دمِ خمارِ ترا بدن
کبھی دادِ شوق نہ دے سکا مرے دل کو پرتوِ دلبری
کہ لرز گیا ہے یہ آئینہ جو لچک گئی ہے کوئی کرن
کوئی میری آنکھوں سے دیکھتا تری بزمِ ناز کی وسعتیں
وہ ہر ایک گوشۂ مکاں مکاں وہ ہر ایک لمحہ زمن زمن
وہ لبوں کی لعل ضیا ضیا، وہ کرن ہنسی کی ذرا ذرا
تری نیم ادا بھی ادا ادا، تری اک جھلک بھی یمن یمن
کوئی چیز آڑے تو آ گئی کہ بخیر ہو گیا خاتمہ
مری بیکسی نے اڑھا دیا مرے آنسوؤں کا مجھے کفن
مرے دوستوں کو معمہ ہے مری لغزو نار کی زندگی
جو ادھر چراغِ حرم کی لو، تو ادھر بھی کفر ہے شعلہ زن
کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے کبھی ایزد و کبھی اہرمن

اُکھڑی اُکھڑی یہ زندگی اُڑی کھوئی کھوئی یہ زندگی

مجھے کیا وطن میں سکوں ہو کہ وطن ہی آج ہے بے وطن
جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی

یہ سوادِ شامِ اجل نما یہ ضیائے صبحِ کفن کفن
تجھے منزلیں کبھی ہیں رہگزر مجھے رہگذاریں بھی منزلیں

یہی فرق ہے مرے ہمسفر وہ ترا چلن یہ مرا چلن
مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالیے

مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن
کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو

کہ غزل ہوئی تو رگوں میں ہے وہی خستگی سی وہی تھکن

یہ اُداس اُداس یہ بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

یہ تو نہیں کہ غم نہیں — ہاں مری آنکھ نم نہیں

تم بھی تو تم نہیں ہو آج — ہم بھی تو آج ہم نہیں

نشّہ سنبھالے ہے مجھے — بہکے ہوئے قدم نہیں

قادرِ دوجہاں ہے گو — عشق کے دم میں دم نہیں

موت اگرچہ موت ہے — موت سے زیست کم نہیں

کس نے کہا یہ تم سے خضر — آبِ حیات سم نہیں

کہتے ہو دہر کو بھرم — مجھ کو تو یہ بھرم نہیں

اب نہ خوشی کی ہے خوشی — غم بھی اب تو غم نہیں

میری نشست ہے زمیں — خلد نہیں، اِرم نہیں

اور ہی ہے مقامِ دل — دیر نہیں، حرم نہیں

قیمتِ حسن دوجہاں — کوئی بڑی رقم نہیں

عہدِ وفا ہے حسنِ یار — قول نہیں، قسم نہیں

لیتے ہیں مول دوجہاں — دام نہیں، درم نہیں

صوم و صلوٰۃ سے فراق
میرے گناہ کم نہیں

لطف نہیں کرم نہیں	جور نہیں ستم نہیں
اب نہیں روئے مہ وشاں	گیسوئے خم بہ خم نہیں
بر سرِ عالمِ وجود	کون سی شے عدم نہیں
یوں ہی نکل گئی اک آہ	رنج نہیں الم نہیں
کیا مری زندگی تری	بھولی ہوئی قسم نہیں
قائلِ حسنِ دلفریب	آپ نہیں کہ ہم نہیں
میں ترا موردِ عتاب	اس سے بڑا کرم نہیں
عالمِ حسنِ محفلِ یار	عالمِ کیف و کم نہیں
جس کے لئے غزل کہوں	ایسا کوئی صنم نہیں
کب سرِ سازِ کائنات	عالمِ زیر و بم نہیں
کب کوئی آہوئے جمیل	مائلِ عزمِ رم نہیں
مظہرِ دو جہاں ہوں میں	عشق ہوں جامِ جم نہیں
رقصِ شرر سے زیرِ پا	زندگی افسم نہیں
ہاں کوئی اور ہی قسم	کھائی ہوئی قسم نہیں
آج بہت اداس ہوں	یوں کوئی خاص غم نہیں

ہائے یہ بیخودیٔ غم آئے جو وہ تو ہم نہیں

غالبؔ و میرؔ و مصحفیؔ

ہم بھی فراقؔ کم نہیں

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا

وہی میل اور وہ سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا

پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں

وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا

آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات

ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

لاکھ کر جور و ستم لاکھ کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جدا ہوتا ہے
آستینوں میں لئے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت
وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

نظر آ جاتے ہیں تم کو تو بہت نازک بال
دل مرا کیا وہی اے شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

آج بھی صید گہِ عشق میں حسنِ سفّاک
لئے ابرو کی لچکتی سی کماں ہے کہ جو تھا

پھر تری چشمِ سخن سنج نے چھیڑی کوئی بات
وہی جادو وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

جادو سے جنکے راز بنے سامنے کی بات
ان آنکھوں کے دلوں پہ کھیلیں کیا معاملات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

کبتک رہیگی آنکھ تری سازِ بے صدا
ہاں ٹوٹ جائے اب یہ سکوتِ نظر تو بات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی غم تھا ترا ڈھل چکی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

عشاق نے سرے سے بدل دیں نشستیں
جو ہو سکا وہ کر گئے اب اسکے آگے بات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

اس جا تری نگاہ مجھے لے گئی جہاں — لیتی ہو جیسے سانس یہ ہیجان کائنات

کیا نیند آئے اس کو جسے جاگنا نہ آئے — جو دن کو دن کرے وہ کرے رات کو بھی رات

دریا کے مد و جزر بھی پانی کے کھیل ہیں — ہستی ہی کے کرشمے ہیں کیا موت کیا حیات

اہلِ رضا میں شانِ بغاوت بھی ہو ذرا — اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات

ہم اہلِ دل ہیں چشمِ کرم سے بھی بے نیاز — سن اے نگاہِ یار اب آ کر پڑی ہے بات

ہم اہلِ غم نے رنگِ زمانہ بدل دیا — کوشش تو کی سبھی نے مگر بن پڑے کی بات

پیدا کرے زمین نئی آسماں نیا — اتنا تو لے کوئی اثرِ دورِ کائنات

اٹھ بندگی سے مالکِ تقدیر بن کے دیکھ — کیا وسوسہ عذاب کا کیا کاوشِ نجات

شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں — چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہمات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

لبِ جاناں میں پھر تبسم ریز
ہو گئی نبضِ کائنات بھی تیز

نگہِ ناز کے بھی ساز نہ چھیڑ
یہ بھی ہے اک صدائے درد انگیز

ہیں وہی پردہ وارِ صبر و سکوں
خامشی جن کی ہے قیامت خیز

کیجیے کیا جو ہو یہ صورتِ حال
عشق بے تاب، حسن کم آمیز

رخصت اے ملتِ کہن کہ ترا
ہو گیا جامِ زندگی لبریز

کشتۂ حسنِ یارِ عالمگیر
عشق کو اپنی ذات سے بھی گریز

اف سیہ کاریاں نگاہوں کی
آہ اندازِ گیسوئے شب ریز

دورِ انسانیت کی شان تو دیکھ
گرد ہے آج سطوتِ چنگیز

لے اڑی کائنات برقِ جمال
توسنِ ناز کو نہ کر مہمیز

ہجر اک دردِ انبساط آگیں
وصل بھی اک نشاطِ غم آمیز

دیکھ سینے میں پڑ نہ جائے لکیر
ہے یہ صہبائے عشق تند و تیز

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ[1] اور کتنی تیز

---

[1] انقلاب کی شام کو کوئی چیز انقلاب سے زیادہ غیر متوقع نہیں ہوتی۔
(اناتول فرانس)

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جسطرح مندروں میں چراغ

جھلکتی ہے کھنچی شمشیر میں نئی دنیا
حیات و موت کے ملتے نہیں ہیں آج دماغ

حریف سینۂ مجروح و آتشِ غمِ عشق
نہ گل کی چاک گریبانیاں نہ لالے کے داغ

وہ جنکے حال میں لو دے اٹھے غمِ فردا
وہی ہیں انجمنِ زندگی کے چشم و چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

نئی زمیں، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو تہمتیں نہ اٹھیں اک جہاں سے انکے سمیت
گناہگارِ محبت نکل گئے بے داغ

جو چھپکے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

جہانِ راز ہوئی جا رہی ہے آنکھ تری
کچھ اسطرح وہ دلوں کا لگا رہے ہیں سراغ

زمانہ کود پڑا آگ میں یہی کہہ کر
کہ خون چاٹ کے ہو جائیگی یہ آگ بھی باغ

نگاہ مطلعِ نو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراقؔ بزم چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

کچھ اشارے تھے جنہیں دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہِ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ غیر اپنی ہی نظر میں ہو گئے
واہ ری غفلت تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ دل کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو کب دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

پردۂ آزردگی میں تھی وہ جانِ التفات
جس ادا کو رنجشِ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کیا کہیں الفت میں رازِ بے حسی کیونکر کھلا
ہر نظر کو تیری دردافزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بے نیازی کو تری پایا سراسر سوز و درد
تجھ کو اک دنیا سے بیگانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

انقلابِ پے بہ پے ہر گردش و ہر دور میں
اس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بھول بیٹھی وہ نگاہِ ناز عہدِ دوستی
اس کو بھی اپنی طبیعت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاف الگ ہم کو جنونِ عاشقی نے کر دیا
خود کو تیرے درد کا پردا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کان بجتے ہیں محبت کے سکوتِ ناز کو
داستاں کا ختم ہو جانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

باتوں باتوں میں پیامِ مرگ بھی آ ہی گیا
ان نگاہوں کو حیات افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب نہیں تابِ سپاسِ حسن اس دل کو جسے
بے قرارِ شکوۂ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک دنیا درد کی تصویر نکلی عشق کو
کوہکن اور قیس کا قصہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دُکھا کے رہ گئیں
ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں

شام سکوں تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں

حسنِ نظر فریب میں کس کو کلام تھا مگر
تیری ادائیں آج تو دل میں سما کے رہ گئیں

تب کہیں کچھ پتہ چلا صدق و خلوص حسن کا
جب وہ نگاہیں عشق سے باتیں بنا کے رہ گئیں

تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے
فصلیں بہار کی جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں

پوچھ نہ ان نگاہوں کی طرفہ کرشمہ سازیاں
فتنے سلا کے رہ گئیں، فتنے جگا کے رہ گئیں

تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدائے درد پر
ان کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں

اُف یہ زمیں کی گردشیں، آہ یہ غم کی ٹھوکریں
یہ بھی تو بختِ خفتہ کے شانے ہلا کے رہ گئیں

اور تو اہلِ درد کو کون سنبھالتا بھلا!
ہاں تیری شادمانیاں ان کو رلا کے رہ گئیں

یاد کچھ آئیں اس طرح بھولی ہوئی کہانیاں
کھوئے ہوئے دلوں میں آج درد اٹھا کے رہ گئیں

سازِ نشاطِ زندگی آج لرز لرز اٹھا
کس کی نگاہِ عشق کا درد سنا کے رہ گئیں

جھوم کے پھر چلیں ہوائیں وجد میں آئیں پھر فضائیں
پھر تری یاد کی گھٹائیں سینوں پہ چھا کے رہ گئیں

تم نہیں آئے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں

قلب و نگاہ کی یہ عید، اُف یہ مآلِ قربِ دید
چرخ کی گردشیں تجھے مجھ سے چھپا کے رہ گئیں

پھر ہیں وہی اداسیاں پھر وہی سونی کائنات
اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
کون سکون دے سکا غمزدگانِ عشق کو
بھیگتی راتیں بھی فراقؔ آگ لگا کے رہ گئیں

ستاروں سے الجھتا جا رہا ہوں
شبِ فرقت بہت گھبرا رہا ہوں

ترے غم کو بھی کچھ بہلا رہا ہوں
جہاں کو بھی سمجھتا جا رہا ہوں

یقیں یہ ہے حقیقت کھل رہی ہے
گماں یہ ہے کہ دھوکے کھا رہا ہوں

اگر ممکن ہو لے لے اپنی آہٹ
خبر دو حسن کو میں آ رہا ہوں

حدیں حسن و محبّت کی ملا کر
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہوں

خبر ہے تجھ کو اے ضبطِ محبّت
ترے ہاتھوں میں لٹتا جا رہا ہوں

اثر بھی لے رہا ہوں تیری چپ کا
تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں

بھرم تیرے ستم کا کھل چکا ہے
میں تجھ سے آج کیوں شرما رہا ہوں

انہیں میں راز ہیں گلباریوں کے
میں جو چنگاریاں برسا رہا ہوں

ترے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسوس
کہ تجھ سے دور ہوتا جا رہا ہوں

حدِ جور و کرم سے بڑھ چلا حسن — نگاہِ یار کو یاد آ رہا ہوں
جو الجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں — وہ گتھی آج تک سلجھا رہا ہوں
محبت اب محبت ہو چلی ہے — تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں
اجل بھی جن کو سن کر جھومتی ہے — وہ نغمے زندگی کے گا رہا ہوں

یہ سناٹا ہے میرے پاؤں کی چھاپ
فراقؔ اپنی کچھ آہٹ پا رہا ہوں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں
شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

ایک مدّت سے تری یاد بھی نہ آئی ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمارِ شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

"ارے صیّاد ہمیں گل ہیں، ہمیں بلبل ہیں"
تو نے کچھ آہ سُنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

آہ! یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

نہیں ہیں پھول تو خاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
خزاں میں رفتہ بہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

ہزاروں شمس و قمر پہلوؤں میں ہیں جن کے
اُن اہلِ دل کے غباروں کو چھیڑ سکتا ہوں

زماں، مکاں ہیں شگفتہ نگاہِ شاعر سے
تمام اداس نظاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

کچھ اور رو کے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی
دبے دبے سے شراروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نگاہِ شوق سے سازِ جمال بول اٹھے
میں اس رباب کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اگر عنایتِ خوباں ہے زندگی کا مدار
تو زندگی کے سہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اشارہ ہے یہ ترے زیرِ لب تبسم کا
نگاہِ ناز کے ماروں کو چھیڑ سکتا ہوں

تمام رمز بتا دوں بہ سادگیٔ نگاہ
تری نظر کے اشاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نئے سرے سے پڑے جان جلتے مردہ میں
میں چلتے پھرتے مزاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

جو تیرے گیسوئے پُر خم سے کھیل بھی نہ سکی
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراق غم بھی مرا ہے حریفِ زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

طرزِ میرؔ

فرقت کی غمگیں راتوں کو یاد میں تیری رو لیں ہیں
تاروں کو جب نیند آئے ہے ہم بھی گھڑی بھر سو لیں ہیں

ساقی بھلا کہاں قسمت میں اب وہ چھلکتے پیمانے
ہم یادوں کے جام چوم کے سوکھے ہونٹ بھگو لیں ہیں

فطرت کی وہ آنکھ مچولی دید کے قابل ہوئے ہے
عالمِ راز میں کلیاں آنکھیں بند کریں ہیں کھولیں ہیں

بے قصور منصور کو ناحق دار و رسن پر کھینچو ہو
لوگو کوئی اور نہیں، یہ پردے سے ہم بولیں ہیں

لاکھ لاکھ ہم ضبط کریں ہیں، دل ہے کہ امڈا آوے ہے

ہمدم آنکھیں بھر آئیں ہیں، نام کبھی اس کا جو لیں ہیں

پتہ پتہ بوٹا بوٹا وجد کرے ہے گلشن میں

جب مشرق میں شفق پھولے ہے نرم ہوائیں ڈولیں ہیں

کون کرے ہے باتیں مجھ سے تنہائی کے پردے میں

ایسے میں کس کی آوازیں کانوں میں رس گھولیں ہیں

جچی تلی میزانِ نظر ہے، کیا مجال جو فرق پڑے

آنکھوں آنکھوں میں وہ دلوں کی رتی رتی تولیں ہیں

حسن کے ہاتھوں جب کہیں جا کر کوئی سرخ رو ہوئے ہے

اہلِ وفا پہلے اپنا منہ اپنے لہو سے دھو لیں ہیں

اب اکثر بیمار رہیں ہیں، کہیں نہیں نکلیں ہیں فراق

حال چال لینے ان کے گھر کبھو کبھو ہم ہو لیں ہیں

نورس غنچے پنکھڑیوں کی نازک گرہیں کھولیں ہیں

یا اُڑ جانے کو رنگ و بو گلشن میں پر تولیں ہیں

تارے آنکھیں جھپکا دیں ہیں ذرہ ذرہ سوئے ہے
تم بھی سنو ہو یارو شب میں سناٹے کچھ بولیں ہیں

ہم ہوں یا قسمت ہو ہماری دونوں کو اک ہی کام ملا
قسمت ہم کو رولیوے ہے، ہم قسمت کو رولیں ہیں

جو مجھ کو بدنام کریں ہیں وے کاش اتنا سوچ سکیں
میرا پردا کھولیں یا اپنا پردا کھولیں ہیں!

یہ قیمت بھی ادا کریں ہیں ہم بہ درستی ہوش و حواس
تیرا سودا کرنے والے دیوانہ بھی ہولیں ہیں

تیرے غم کا پاس ادب ہے کچھ دنیا کا خیال بھی ہے
سب سے چھپا کے درد کے مارے چپکے چپکے رولیں ہیں

فطرت کا قائم توازن عالم حسن و عشق میں بھی
اس کو اتنا ہی پا دیں ہیں، خود کو جتنا کھولیں ہیں

آب و تاب اشعار نہ پوچھو، تم بھی آنکھیں رکھو ہو
یہ جگ مگ بتیوں کی دمک ہے یا ہم موتی رولیں ہیں

ایسے میں تو یاد آئے ہے انجمن مے میں رندوں کو
رات گئے گردوں پہ فرشتے بابِ گنہ جب کھولیں ہیں

صدقے فراقؔ اعجازِ سخن کے کیسے اڑالی یہ آواز
ان غزلوں کے پردوں میں تو میرؔ کی غزلیں بولیں ہیں

اب اکثر چپ چپ سے رہیں ہیں یونہی کبھو لب کھولیں ہیں
پہلے فراقؔ کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولیں ہیں

دن میں ہم کو دیکھنے والو اپنے اپنے ہیں اوقات
جاؤ نہ تم ان خشک آنکھوں پر ہم راتوں کو رولیں ہیں

فطرت میری عشق و محبت، قسمت میری تنہائی
کہنے کی نوبت ہی نہ آئی ہم بھی کسو کے ہولیں ہیں

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولیں ہیں

باغ میں وہ خواب آور عالم موجِ صبا کے اشاروں پر
ڈالی ڈالی نورس پتے سہج سہج جب ڈولیں ہیں

اُف وہ لبوں پر موجِ تبسّم جیسے کروٹیں لیں کوندے
ہائے وہ عالم جنبشِ مژگاں جب فتنے پر تولیں ہیں

نقش و نگارِ غزل میں جو تم یہ شادابی پاؤ ہو
ہم اشکوں میں کائنات کے نوکِ قلم کو ڈبو لیں ہیں

اُن راتوں کو حریمِ ناز کا اِک عالم ہوئے ندیم
خلوت میں وہ نرم انگلیاں بندِ قبا جب کھولیں ہیں

غم کا فسانہ سننے والو، آخرِ شب آرام کرو
کل یہ کہانی پھر چھیڑیں گے ہم بھی ذرا اب سو لیں ہیں

ہم لوگ اب تو اجنبی سے ہیں کچھ تو بتاؤ حالِ فراقؔ
اب تو تمھیں سے پیار کریں ہیں اب تو تمھیں سے بولیں ہیں

ہم سے فراقؔ چھپ چھپ کر پہروں پہروں رووُ ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے، کیا تم اس میں دیکھو ہو

جن کو اتنا یاد کرو ہو، چلتے پھرتے سائے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری نام و نشاں کیا پوچھو ہو

جانے بھی دو نام کسی کا آگیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا کچھ تو کہو کیا سوچو ہو

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جاتی ہے
میں تو سراسر کھو جاتا ہوں، یاد اتنا کیوں آتے ہو

کیا غمِ دوراں کی پرچھائیں، تم پر بھی پڑ جاتی ہے
کیا یاد آ جاتا ہے، یکایک کیوں اداس ہو جاتے ہو

چھوٹی شکایت بھی جو کروں ہو پلک دیپ جل جاتے ہیں
تم کو چھیڑے بھی کیا تم تو ہنسی ہنسی میں رو دو ہو

غم سے خمیرِ عشق اٹھا ہے حسن کو دیویں کیا الزام
اس کے کرم پر اتنی اداسی، دل والو کیا چاہو ہو

ایک شخص کے مر جانے سے کیا ہو جاتا ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئے ہیں پیدا، پچھتاؤ گے دیکھو ہو

اتنی وحشت اتنی وحشت صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو، میں نہ شکاری دور اتنا کیوں بھاگو ہو

میرے نغمے کس کے لئے ہیں خود مجھ کو معلوم نہیں
کبھی نہ پوچھو یہ شاعر سے تم کس کے گن گاؤ ہو

پلکیں بند السائی زلفیں نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم سوئے ہو یا جاگو ہو

اتنے تپاک سے مجھ سے ملو ہو پھر بھی یہ غیریت کیوں
تم جسے یاد آؤ ہو برابر میں ہوں وہی تم بھولو ہو

کبھی بنا دو ہو سینے کو جلووں سے رشکِ گلزار
کبھی رنگِ رُخ بن کر تم یاد آتے ہی اڑ جاؤ ہو

گاہ ترس جائیں ہیں آنکھیں رسجل روپ کے درشن کو
گاہ نیند بن کر راتوں کو نین پٹوں میں آؤ ہو

اس دنیا ہی میں سنیں ہیں اک دنیائے محبت بھی
ہم بھی اسی جانب جاویں ہیں بولو تم بھی آؤ ہو

بہت دنوں میں یاد کیا ہے بات بنائیں کیا اُن سے
جیون ساتھی دکھ پوچھیں ہیں کس کو ہمیں تم سونپو ہو

چپ چپ سی ہے فضائے محبت کچھ نہ کہے ہو خلوت ناز
نرم اشاروں سے آنکھوں کے بات کہاں پہنچاؤ ہو

ابھی اسی کا انتظار تھا اور کتنا اے اہلِ وفا
چشمِ کرم جب اٹھنے لگی ہے تو اب تم شرماؤ ہو

غم کے ساز سے چنچل انگلیاں کھیل رہی ہیں رات گئے
جن کا سکوتِ سکوتِ ابد ہے وہ پردے کیوں چھیڑو ہو

کچھ تو بتاؤ رنگ روپ بھی تم اس کا اے اہلِ نظر
تم تو اس کو جب دیکھو ہو دیکھتے ہی رہ جاؤ ہو
اکثر گہری سوچ میں ان کو کھویا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراقؔ کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو

وعدے کی رات مرحبا آمدِ یار مہرباں
زلفِ سیہ شب فشاں عارضِ ناز مہ چکاں
برقِ جمال میں تری خفتہ سکونِ بیکراں
اور مرا دلِ تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یادیں آ کے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں
چھیڑ کے داستانِ غم اہلِ وطن کے درمیاں
ہم ابھی بیچ ہی میں تھے اور بدل گئی زباں
اپنی غزل میں ہم جسے کہتے رہے ہیں بارہا
وہ تری داستاں کہاں وہ تو ہے زیبِ داستاں

کوئی نہ کوئی بات ہے اسکے سکوتِ یاس میں
بھول گیا ہے سب گلے آج تو عشقِ بدگماں

رات کمال کر گئیں عالمِ کربِ درد میں
دل کو مرے سلا گئیں تیری نظر کی لوریاں

سرحدِ غیب تک تجھے صاف ملینگے نقشِ پا
پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں ترے لئے کہاں کہاں

کہتے ہیں میری موت پر اسکو بھی چھین ہی لیا
عشق کو مدتوں کے بعد ملا تھا ایک ترجماں

رنگ جما کے اٹھ گئی کتنی تمدنوں کی بزم
یاد نہیں زمین کو بھول چکا ہے آسماں

عارضیت کا سوز بھی دیکھ تو سوزِ عارضی
بیتے ہوئے جگوں سے پوچھ کس کو ثبات ہے یہاں

کوئی نہیں جو ساتھ دے ترے حریمِ راز تک
بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترے نشاں

جس کو بھی دیکھئے وہی بزم میں ہے غزل سرا
چھڑ گئی داستانِ دل پھر بحدیثِ دیگراں

بیت گئے ہیں لاکھ جگ سوئے وطن چلے ہوئے
پہنچی ہے آدمی کی ذات چار قدم کشاں کشاں

یادوں سے فرقِ ناز تک برق تبسم نشاط
حسنِ چمن فروش کو دیکھ جہاں سے گلستاں

دادِ سخنوری ملی ابروئے ناز اٹھ گئے
ہے وہی داستانِ دل حسن بھی کہہ اٹھے کہ ہاں

جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے
رات وہ دستِ ناز میں جامِ نشاطِ ارغواں

رازِ وجود کچھ نہ پوچھ صبحِ ازل سے آج تک
کتنے یقین چل بسے کتنے گزر گئے گماں

نرگسِ نازِ مرحبا زد میں ہے جس کی کائنات
چٹکی میں ناوکِ نگاہ جنبش بھویں کماں کماں

مجھ سے یہی کہیں گی کیا گذری ہے مجھ پہ رات بھر
جو مری آستیں پہ ہیں تیرے غموں کی سرخیاں

حسنِ ازل کی جلوہ گاہ آئینۂ سکوتِ راز
دیکھ تو ہے عیاں عیاں پوچھ تو ہے نہاں نہاں

دور بہت زمین سے پہنچی ہے اک کرن کی چوٹ
نیم تبسّم خفی! رہ گئیں پس کے بجلیاں

کتنے تصوّرات کے، کتنے ہی واردات کے
لعل و گہر لٹا گیا دل ہے کہ گنجِ شائگاں

سینوں میں درد بھر دیا چھیڑ کے داستانِ حُسن
آج تو کام کر گئی عشق کی عمرِ رائیگاں

آہ! فریبِ رنگ و بو اپنی شکست آپ ہے
بعدِ نظارۂ بہار بڑھ گئیں اور اداسیاں

اے مری شامِ انتظار کون آگیا یہ لئے
زلفوں میں ایک شب دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

مجھ کو فراق یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست
پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں دمہ چکاں
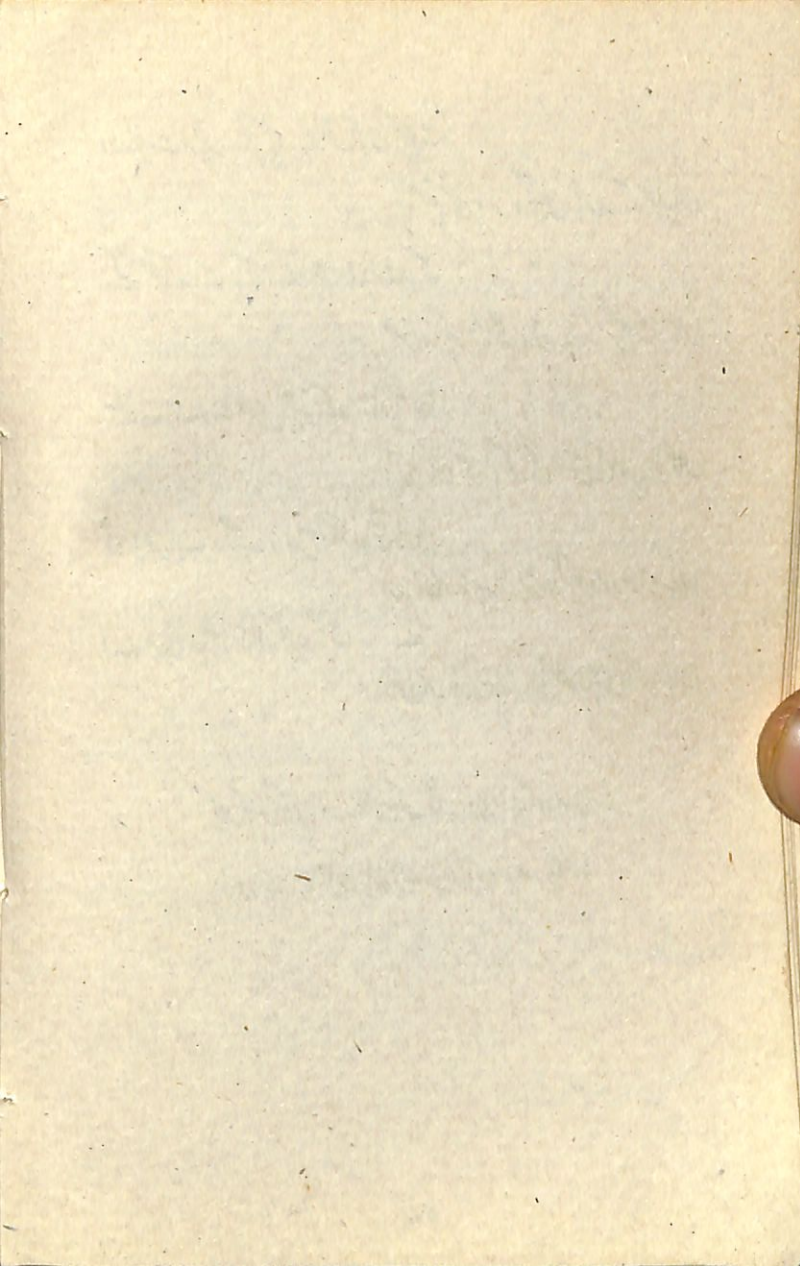
نظمیں

رقصِ شب تاب

رات ہنس دیتی ہے بادۂ پرنم ساقی
بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
جگمگا اٹھتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی
جب پیالوں میں چراغوں کی لویں ڈھلتی ہیں

تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی
تا بہ نہہ گنبدِ افلاک گمک جاتی ہے
چنگ سے اٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی
تیرگی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

آتی ہیں مدبھرے سنگیت کی لپٹیں ساقی
آگ آکاش کے سینے میں وہ دہکاتی ہوئی
انگلیاں ساز کے پردوں میں رواں ہیں ساقی
اس جواں رات کے دل کی کسک اکساتی ہوئی

پھول گرتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی
ساز کی آنچ پہ رقصندہ شراروں کا گماں

گرمیٔ رقص سے دمکے ہوئے پیکر ساقی
وہ پسینے کی جھلک دیتی ہوئی کاہکشاں

رقصِ شب تاب سے ہر عضو درخشاں ساقی
برقِ سیّال لچکتی ہوئی شریانوں میں

جیسے ہو جائے سرِ شام چراغاں ساقی
جسم رنگیں کے لہکتے شفقستانوں میں

رقص میں پیکرِ نازک کا لچکنا ساقی
انگ کے لوچ میں کل راگنیاں جھومتی ہیں

یہ مدھر بول، یہ کوندوں کا لپکنا ساقی
لالہ گوں ہونٹوں کو نغموں کی لویں چومتی ہیں

دُوپ سے پھوٹتا ہے نور کا تڑکا ساقی
کنول اُن نازنیں ہاتھوں کے لٹاتے ہوئے جس

جیسے دو چاندوں سے امرت کی ہو برکھا ساقی
ناچتے وقت چھلک جاتا ہے یوں جوبن رس

رس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی
سات رنگوں کی سجل قوس یہ باہوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھماچھم ساقی
رخِ گل رنگ پہ سنگیت کی یہ تیز دمک

جام اچھلتے ہیں لویں دیتی ہیں سرشار فضائیں
شعلے آواز کے سانچے میں یہاں ڈھلتے ہیں
آنکھیں جھپکاتی ہیں رہ رہ کے نم آلود ہوائیں
رقص کی شوخ اداؤں سے کنول جلتے ہیں

شعلے جب ماہ بھرے سنگیت کے لو دیتے ہیں
جگمگا اٹھتی ہے پیشانیٔ دوراں ساقی
نغمے جب زیرِ فلک کانپ کے دم لیتے ہیں
جھلملا اٹھتا ہے تاروں کا چراغاں ساقی

یہ شب افروز نواؤں کی لپک اے ساقی
زندگی اپنی جوانی پہ خود اترائی ہوئی
نشّۂ رقص میں چہروں کی دمک اے ساقی
جیسے آئینہ در آئینہ بہار آئی ہوئی

موہنی روپ کی سنگیت کا جادو ساقی

آئینۂ زیر و بم رقص کا، ہر عضوِ بدن
دلِ بیتاب، بدلتے ہوئے پہلو ساقی
دیکھیے پڑتی ہے کس پر نگہِ صاعقہ زن
گت میں اندازِ جہانِ گذراں ہے ساقی
سُر کے پردوں سے کوئی دردِ نہاں اُٹھتا ہے
بزم میں عُود کی موجوں کا سماں ہے ساقی
صاف ہیرے سے سرنگی کے دھواں اُٹھتا ہے
رین سنگیت کے اب بھیگ چلے ہیں شعلے
سرنگوں سانس گلے لوچ کے خم ہیں ساقی
انگلیاں تیرگی چٹخاتی ہے گیسو کھولے
برقِ آواز کی پلکیں بھی تو نم ہیں ساقی
رات لیتی ہے جماہی پر جماہی ساقی
ہر نظر جاگے ہوئے تاروں کی السائی ہوئی
چُور کتنی ہے تری نیم نگاہی ساقی
مد میں ڈوبے ہوئے سنگیت کو نیند آئی ہوئی

بزمِ برشگال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے
آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
"زرّیں کمرے، کج کلہے، تنگ قبائے"
پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے
اک برق ادا، شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں
گلہائے مہ و مہر کو پہلو میں دبائے
کوندا ہو گداز، اُف یہ تبسّم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک تو جو ستاروں سے چرائے

لو دیتا ہوا صبحِ بہاراں کا ترنم

وہ نرم صباحت جو رچی بھیرویں گائے

وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے

وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے

وہ چہرۂ شاداب کہ اک خوابِ گلستاں

وہ موجِ نفس خوشبوؤں کو نیند سی آئے

سنگیت کے سینے میں چراغاں کرے آواز

انداز، دل ساز کی دھڑکن کبھی نہ پائے

گھنگھور گھٹا کعبہ پہ منڈلائے، دلوں پر

پڑتے رہیں نمناک گھنی پلکوں کے سائے

حُسنِ عرق آلود چراغِ تہِ داماں

کافوری کنول چادرِ شبنم میں چھپائے

وہ نرم کلامی کہ سکوت آنکھ اٹھا دے

آہستہ خرامی کہ فضا وجد میں آئے

وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز

دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی؟
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

برقِ نگہِ شوق کے صدقے کہ دلوں پر
بجلی بھی گرے حسن پہ بھی آنچ نہ آئے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکی چلی جائے

رنگین جوانی کی اِدھر ٹوٹتی انگڑائی
تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے

وہ رنگ جو ہو جلوہ دہِ نغمہ سجنت
وہ روپ حقیقت کو جو آئینہ دکھائے

زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات
روئے شفق آمیز سے پو پھوٹتی جائے

وہ کشف و کرامات دمِ جلوہ نمائی
چادر سی نگاہوں سے سرکتی چلی جائے

کیوں تیرے غمِ ہجر میں نمناک ہیں پلکیں
کیوں یاد تری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے
کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

شاعر ہیں فراق آپ بڑے پائے کے لیکن
رکھّا ہے عجب نام کہ جو راس نہ آئے

آدھی رات

(۱)

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گمشدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں ــــــ جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
ــــــ فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

(۲)

تمولیوں کی دوکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی

کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر

سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں

کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگار کا پیڑ

دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل

یہ موجِ نور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات

کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول

سپاہ روس ہیں اب کتنی دور برلن سے

— جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو —

چھلک رہی ہے خمِ غیب سے شرابِ وجود

فضائے نیم شبی نرگسِ خمار آلود

کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

(۳)

یہ رس کا سیج، یہ سکمار یہ سکومل گات
نین کمل کی جھپک کام روپ کا جادو
یہ رسمسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں
فلک پہ بکھرے ہوئے چاند اور ستاروں کی
چمکتی انگلیوں سے چھڑ کے سازِ فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں ـــ تم بھی جاگ اٹھو

(۴)

شعاعِ مہر نے یوں ان کو چوم چوم لیا
ندی کے بیچ، کمُدنی کے پھول کھِل اُٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا ـــ
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی
حنا کی ٹٹیوں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنسناہٹ سی
لٹوں میں رات کی دیوی کی تھرتھراہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہوگی

(۵)

یہ محوِ خواب ہیں رنگین مچھلیاں تہِ آب
کہ حوضِ صحن میں اب ان کی چشمکیں بھی نہیں
یہ سرنگوں ہیں سرِ شاخ پھول گڑہل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑجائیں
یہ چاندنی ہے کہ امڈا ہوا ہے رس ساگر
اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں

(٦)

قریب چاند کے منڈلا رہی ہے اک چڑیا
بھنور میں نور کے کروٹ سے جیسے ناؤ چلے
کہ جیسے سینۂ شاعر میں کوئی خواب پلے
وہ خواب سانچے میں جس کے نئی حیات ڈھلے
وہ خواب جس سے پرانا نظامِ غم بدلے
کہاں سے آتی ہے مدمالتی لتا کی لپٹ
کہ جیسے سینکڑوں پریاں گلابیاں چھڑکائیں

کہ جیسے سینکڑوں بن دیویوں نے جھولے پر
ادائے خاص سے اک ساتھ بال کھول دیئے
لگے ہیں کان ستاروں کے جس کی آہٹ پر
اس انقلاب کی کوئی خبر نہیں آتی
دلِ نجوم دھڑکتے ہیں کان بجتے ہیں

(۷)

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات یہ شبِ ماہ
یہ پرسکوں یہ پراسرار یہ اداس سماں
یہ نرم نرم ہواؤں کے نیلگوں جھونکے
فضا کی اوٹ میں مُردوں کی گنگناہٹ ہے
یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے
دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ
خنک دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ
ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن

حیات پردۂ شب میں بدلتی ہے پہلو
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا!
مرے خیال میں اب ایک بج رہا ہوگا!

(۸)

گلوں نے چادرِ شبنم سے منھ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں

اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوتِ نیم شبی ہے انھیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

نئی زمیں، نیا آسماں، نئی دنیا
نئے ستارے، نئی گردشیں، نئے دن رات
زمیں سے تا بہ فلک انتظار کا عالم
فضائے زرد میں، دھندلے غبار کا عالم
ہے موجِ دود کہ دھندلی فضا کی نبضیں ہیں
تمام خستگی و ماندگی یہ دورِ حیات
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات
یہ سرد سرد یہ بیجان پھیکی پھیکی چمک
نظامِ ثانیہ کی موت کا پسینا ہے[1]
خود اپنے آپ میں یہ کائنات ڈوب گئی
خود اپنی کوکھ سے پھر جگمگا کے ابھرے گی
بدل کے کیچلی جس طرح ناگ لہرائے!

---

[1] پہلا نظام جاگیرداری، دوسرا نظام سرمایہ داری، تیسرا نظام اشتراکیت (فراق)

خنک فضاؤں میں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
کہ آبگینوں پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار
یہ موجِ غفلتِ معصوم یہ خمارِ بدن
یہ سانس نیند میں ڈوبی یہ آنکھ مدماتی
اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

ہنڈولہ

دیارِ ہند تھا گہوارہ ——— یاد ہے ہمدم؟
بہت زمانہ ہوا ——— کس کے کس کے بچپن کا
اِسی زمین پہ کھیلا ہے رامؔ کا بچپن
اسی زمین پہ اُن ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے میں دھنش بان کو سنبھالا تھا
اِسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا، سلوچنا، رادھا
کسی زمانہ میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی
یہی زمین، یہی دریا، پہاڑ، جنگل، باغ
یہی ہوائیں، یہی صبح و شام، سورج چاند
یہی گھٹائیں، یہی برق و رعد و قوسِ قزح
یہیں کے گیت، روایات، موسموں کے جلوس

ہوا زمانہ کہ سدھارتھ کے تھے گہوارے
انہی میں آنکھ کھلی تھی اشوک اعظم کی
انہی نظاروں میں بچپن کٹا تھا وکرم کا
سنا ہے بھرتری بھی انہیں سے کھیلا تھا
بھرت[1]، اگست، کپل، دیاس، پاشی، کوٹلیہ
جنک وششٹ، منو، والمیک، وشوامتر
کناد، گوتم و راما انج، کمارل بھٹ
موہنجوڈارو، ہڑپا کے اور اجنتا کے
بنانے والے یہیں بلّموں سے کھیلے تھے
اسی ہنڈولے میں بھو بھوت و کالیداس کبھی
ہمک ہمک کے جو تتلا کے گنگنائے تھے
سرسوتی نے زبانوں کو ان کی چوما تھا
یہیں کے چاند و سورج[2] کھلونے تھے اُن کے

---

[1] شکنتلا کا بیٹا جس کے نام کی رعایت سے یہ ملک "بھارت" کہلایا۔

[2] میں سلیقہ کے ساتھ ہندی الفاظ کے درمیان عطف لانا جائز رکھتا ہوں۔
(فراق)

انہی فضاؤں میں بچپن پلا تھا خسرو کا
اسی زمیں سے اٹھے تان سین اور اکبر
رحیم و نانک و چیتنیہ اور چشتی نے
انہی فضاؤں میں بچپن کے دن گزارے تھے
اسی زمیں پہ کبھی شاہزادۂ خرّم
ذرا سی دل شکنی پر جو رو دیا ہوگا
بھر آیا تھا دل نازک تو کیا عجب اس نے
اُن آنسوؤں میں جھلک تاج کی بھی دیکھی ہو
اہلیا بائی، دمن، پدمنی و رضیہ نے
یہیں کے پیڑوں کی شاخوں میں ڈالے تھے جھولے
اسی فضا میں بڑھائی تھی پینگ بچپن کی
انہی نظاروں میں ساون کے گیت گائے تھے
اسی زمین پہ گھٹنوں کے بل چلے ہوں گے
ملک محمّد و رس کھان اور تلسی داس
انہی فضاؤں میں گونجی تھی توتلی بولی
کبیر داس، ٹکارام، سور و میرا کی

اسی ہنڈولے میں ودیاپتی کا کنٹھ کھلا
اسی زمین کے تھے لال میر و غالب بھی
ٹھمک ٹھمک کے چلے تھے گھروں کے آنگن میں
انیس و حالی و اقبال اور وارث شاہ
یہیں کی خاک سے ابھرے تھے پریم چند و ٹیگور
یہیں سے اٹھے تھے تہذیب ہند کے معمار
اسی زمین نے دیکھا تھا بال پن ان کا
یہیں دکھائی تھیں ان سب نے بال لیلائیں
یہیں ہر ایک کے بچپن نے تربیت پائی
یہیں ہر ایک کے جیون کا بال کانڈ کھلا
یہیں سے اٹھتے بگولوں کے ساتھ دوڑے ہیں
یہیں کی مست گھٹاؤں کے ساتھ جھومے ہیں
یہیں کی مد بھری برسات میں نہائے ہیں
لپٹ کے کیچڑ و پانی سے بچپنے اُن کے
اسی زمین سے اٹھے وہ دیش کے ساونت
اڑا دیا تھا جنھیں کمپنی نے توپوں سے

اسی زمین سے اٹھی ہیں اَن گنت نسلیں

پلے ہیں ہند ہنڈولے میں اَن گنت بچّے

مجھ ایسے کتنے ہی گمنام بچّے کھیلے ہیں

مجھ ایسے کتنے ہی گمنام مرد و زن اٹھے

اسی زمیں سے اسی میں سپردِ خاک ہوئے

زمین ہند اب آرام گاہ ہے ان کی

اس ارضِ پاک سے اٹھیں بہت سی تہذیبیں

یہیں طلوع ہوئیں اور یہیں غروب ہوئیں

اسی زمین سے ابھرے کئی علوم و فنون

فرازِ کوہِ ہمالہ، یہ رودِ گنگ و جمن

اور ان کی گود میں پروردہ کارواں نے

یہیں رموزِ خرامِ سکوں نما سیکھے

نسیمِ صبحِ تمدّن نے بھیرویں چھیڑی

یہیں وطن کے ترانوں کی وہ پویں پھوٹیں

وہ بے قرار سکوں زا، ترنّمِ سحری

وہ کپکپاتے ہوئے سوز و ساز کے شعلے

انہی فضاؤں میں انگڑائیاں جو لے کے اٹھے
لوؤں سے جن کے چراغاں ہوئی تھی بزمِ حیات
جنھوں نے ہند کی تہذیب کو ــــ زمانہ ہوا
بہت سے زاویوں سے آئینہ دکھایا تھا
اسی زمیں پہ ڈھلی ہے مری حیات کی شام
اسی زمیں پہ وہ صبح مسکرائی ہے
تمام شعلہ و شبنم، مری حیات کی صبح
سناؤں آج کہانی میں اپنے بچپن کی
دل و دماغ کی کلیاں ابھی نہ چٹکی تھیں
ہمیشہ کھیلتا رہتا تھا بھائی بہنوں میں
ہمارے ساتھ محلّے کی لڑکیاں لڑکے
مچائے رکھتے تھے بالک اُدھم ہر ایک گھڑی
لہو ترنگ، اچھل پھاند کا یہ عالم تھا
محلّہ سر پہ اٹھائے پھرے جدھر گزرے
ہمارے چیخے اور شور گونجتے رہتے
چہار سمت محلّے کے گوشے گوشے میں

فضا میں آج بھی لاریب گونجتے ہونگے[1]

اگرچہ دوسرے بچوں کی طرح تھا میں بھی
بظاہر اوروں کے بچپن سا تھا مرا بچپن
یہ سب سہی مرے بچپن کی شخصیت بھی تھی ایک
وہ شخصیت کہ بہت شوخ جس کے تھے خدوخال
ادا ادا میں کوئی شانِ انفرادی تھی
غرض کچھ اور ہی لچھّن تھے میرے بچپن کے
مجھے تھا چھوٹے بڑوں سے شدید لگاؤ
ہر ایک پر میں چھڑکتا تھا اپنی ننھّی سی جان
دل اُمنڈ آتا تھا ایسا کہ جی یہ چاہتا تھا
اٹھا کے رکھ لوں کلیجے میں اپنی دنیا کو
مجھے ہے یاد ابھی تک کہ کھیل کود میں بھی
کچھ ایسے وقفے پُراسرار آہی جاتے تھے
کہ جن میں سوچنے لگتا تھا کچھ مرا بچپن

---

[1] آواز کبھی فنا نہیں ہوتی (فراق)

کئی معانی بے لفظ چھونے لگتے تھے
بطونِ غیب سے میرے شعورِ اصغر کو
ہر ایک منظرِ مانوس، گھر کا ہر گوشہ
کسی طرح کی ہو گھر میں سجی ہوئی ہر چیز
مرے محلّے کی گلیاں، مکاں، در و دیوار
چبوترے، کنویں، کچھ پیڑ، جھاڑیاں، بیلیں
وہ پھیری والے کئی انکے بھانت بھانت کے بول
وہ جانے بوجھے مناظر، وہ آسمان و زمیں
بدلتے وقت کا آئینہ، گرمی و خنکی
غروب مہر میں رنگوں کا جاگتا جادو
شفق کے شیش محل میں گداز پنہاں سے
جواہروں کی چٹانیں سی کچھ پگھلتی ہوئی
شجر حجر کی وہ کچھ سوچتی ہوئی دنیا
سہانی رات کی مانوس رمزیت کا فسوں
علی الصباح افق کی وہ تھرتھراتی بھویں
کسی کا جھانکنا آہستہ پھوٹتی پو سے

وہ دوپہر کا سمے درجۂ تپش کا چڑھاؤ
تھکی تھکی سی فضا میں وہ زندگی کا آثار
ہوا کی بنسیاں بنسواڑیوں میں بجتی ہوئی
وہ دن کے بڑھتے ہوئے سائے سہ پہر کا سکوں
سکوتِ شام کا جب دونوں وقت ملتے ہیں
غرض جھلکتے ہوئے سرسری مناظر پر
مجھے گمان پرستانیت کا ہوتا تھا
ہر ایک چیز کی وہ خواب ناک اصلیت
مرے شعور کی چلمن سے جھانکتا تھا کوئی
لئے ربوبیتِ کائنات کا احساس
ہر ایک جلوے میں غیب و شہود کا وہ ملاپ
ہر ایک نظارہ اک آئینہ خانۂ حیرت
ہر ایک منظرِ مانوس ایک حیرت زار
کہیں رہوں، کہیں کھیلوں کہیں پڑھوں لکھوں
مرے شعور پہ منڈلاتے تھے مناظرِ دہر
میں اکثر اُن کے تصوّر میں ڈوب جاتا تھا

وفورِ جذبہ سے ہو جاتی تھی مژہ پرنم
مجھے یقین ہے ان عنصری مناظر سے
کہ عام بچوں سے لیتا تھا میں اثر زیادہ
کسی سمے مری طفلی رہی نہ بے پروا
نہ چھو سکی مری طفلی کو غفلتِ طفلی
یہ کھیل کود کے لمحوں میں ہوتا تھا احساس
دعائیں دیتا ہو جیسے مجھے سکوتِ دوام
کہ جیسے ہاتھ ابد رکھ دے دوشِ طفلی پر
ہر اک لمحہ کے رخنوں سے جھانکتی صدیاں
کہانیاں جو سنوں ان میں ڈوب جاتا تھا
کہ آدمی کے لئے آدمی کی جگ بیتی
سے بڑھ کے کون سی شے اور ہو ہی سکتی ہے
انھی فسانوں میں پنہاں تھے زندگی کے رموز
انھی فسانوں میں کھلتے تھے رازہائے حیات
انھی فسانوں میں ملتی تھیں زیست کی قدریں
رموزِ بیش بہا ٹھیٹھ آدمیت کے

کہانیاں تھیں کہ صد درس گاہِ رقّتِ قلب
ہر اک کہانی میں شائستگیِ غم کا سبق
وہ عنصر آنسوؤں کا داستانِ انساں میں
وہ نل دمن کی کتھا، سرگزشتِ ساوتری
شکنتلا کی کہانی، بھرت[1] کی قربانی
وہ مرگِ بھیشم پتامہ، وہ سیج تیروں کی
وہ پانچوں پانڈوں کی سرگ یاترا کی کتھا
وطن سے رخصتِ سدھارتھ، رام کا بن باس
وفا کے بعد بھی سیتا کی وہ جلا وطنی
وہ راتوں رات سری کرشن کو اٹھائے ہوئے
بلا کی قید سے بدلیو کا نکل جانا
وہ اندھکار، وہ بارش، بڑھی ہوئی جمنا
غم آفرین کہانی، وہ ہیر رانجھا کی
شعورِ ہند کے بچپن کی یادگارِ عظیم

---

[1] یہاں بھرت سے مراد رام کے بھائی سے ہے (فراق)

کہ ایسے ویسے تخیل کی سانس اکھڑ جائے
کئی محیّرِ ادراک دیو مالائیں
ہت اوپدیش کے قصّے، کتھا، سرت ساگر
کروڑوں سینوں میں وہ گونجتا ہوا آیا
میں پوچھتا ہوں کسی اور ملک والوں سے
کہانیوں کی یہ دولت، یہ بے بہا دولت
فسانے دیکھ لو ان کے، نظر بھی آتی ہے
میں پوچھتا ہوں کہ گہوارے اور قوموں کے
بسے ہوئے ہیں کہیں ایسی داستانوں سے
کہانیاں جو میں سنتا تھا اپنے بچپن میں
مرے لئے وہ نہ تھیں محض باعثِ تفریح
فسانوں سے مرے بچپن نے سوچنا سیکھا
فسانوں سے مجھے سنجیدگی کے درس ملے
فسانوں میں نظر آتی تھی مجھ کو یہ دنیا
غم و خوشی میں رچی پیار میں بسائی ہوئی
فسانوں سے مرے دِل نے گھلاوٹیں پائیں

یہی نہیں کہ مشاہیر ہی کے افسانے
ذرا سی عمر میں کرتے ہوں مجھ کو متاثر
محلے ٹولے کے گمنام آدمیوں کے
کچھ ایسے سننے میں آتے تھے واقعاتِ حیات
جو یوں تو ہوتے تھے "فرسودہ اور معمولی"
مگر تھے آئینے اخلاص اور شرافت کے
یہ چند آئی گئی باتیں ایسی باتیں تھیں
کہ جن کی اوٹ چمکتا تھا دردِ انسانی
یہ واردات نہیں' رزمیئے حیات کے تھے
غرض کہ یہ ہیں مرے بچپنے کی تصویریں
ندیم اور کبھی کچھ خط و خال ہیں ان کے
یہ میری ماں کا ہے کہنا کہ جب میں بچہ تھا
میں ایسے آدمی کی گود میں نہ جاتا تھا
جو بد قوارہ ہو، عیبی ہو یا ہو بد صورت!
مجھے بھی یاد ہے نو دس برس ہی کا میں تھا
تو مجھ پہ کرتا تھا جادو سا حسنِ انسانی

کچھ ایسا ہوتا تھا محسوس جب میں دیکھتا تھا
شگفتہ رنگ، تر و تازہ روپ والوں کا
کہ ان کی آنچ مری ہڈیاں گلا دے گی
اِک آزمائشِ جاں تھی کہ تھا شعورِ جمال
اور اس کی نشتریت اس کی استخواں سوزی
غم و نشاط، لگاوٹ، محبت و نفرت
اک انتشار، سکوں، اضطراب، پیار، عتاب
وہ بے پناہ ذکی الحسی، وہ حلم و غرور
کبھی کبھی وہ بھرے گھر میں حسِ تنہائی
وہ وحشتیں مری ماحولِ خوشگوار میں بھی
مری سرشت میں ضدین کے کئی جوڑے
شروع ہی سے تھے موجود آب و تاب کے ساتھ
مرے مزاج میں پنہاں تھی ایک جدلیت
رگوں میں چھوٹتے رہتے تھے بے شمار انار
ندیم یہ ہیں مرے بالپن کے کچھ آثار
وفورِ و شدتِ جذبات کا یہ عالم تھا

کہ کوندے جست کریں دل کے آبگینے میں
وہ بچپنا جسے برداشت اپنی مشکل ہو
وہ بچپنا جو خود اپنے پہ تیوریاں سی چڑھائے
ندیم ذکرِ جوانی سے کانپ جاتا ہوں
جوانی آئی دبے پاؤں اور یوں آئی
کہ اس کے آتے ہی بگڑا بنا بنایا کھیل
وہ خواہشات کے، جذبات کے امڈتے ہوئے
وہ ہو نکتے ہوئے بے نام آگ کے طوفاں
وہ پھوٹتا ہوا جوالا مکھی جوانی کا
رگوں میں اٹھتی ہوئی آندھیوں کے وہ جھٹکے
کہ جو توازنِ ہستی جھنجھوڑ کے رکھ دیں
وہ زلزلے کہ پہاڑوں کے پیر اکھڑ جائیں
بلوغیّت کی وہ ٹیسیں وہ کربِ نشو و نما
اور ایسے میں مجھے بیاہا گیا بھلا کس سے
جو ہو نہ سکتی تھی ہرگز مری شریکِ حیات

ہم ایک دوسرے کے واسطے بنے ہی نہ تھے
سیاہ ہو گئی دنیا مری نگاہوں میں
وہ جس کو کہتے ہیں شادیٔ خانہ آبادی
مرے لئے ہوئی شادیٔ خانہ بربادی
مرے لئے وہ بنی بیوگی جوانی کی
لٹا سہاگ مری زندگی کا مانڈو میں
ندیم کھا گئی مجھ کو نظر جوانی کی
بلائے جان مجھے ہو گیا شعورِ جمال
تلاشِ شعلۂ الفت سے یہ ہوا حاصل
کہ نفرتوں کا اگن کنڈ بن گئی ہستی
وہ حلق و سینہ و رگ رگ میں بے پناہ چبھا
ندیم جیسے نگل لی ہو میں نے ناگ پھنی
زعشق زادم و عشقم بکشت زارو دریغ
خبر نہ برد بہ رستم کسے کہ سہرابم
نہ پوچھ عالمِ کام و دہن ندیم مرے
ثمرِ حیات کا جب راکھ بن گیا منہ میں

میں چلتی پھرتی چتا بن گیا جوانی کی
میں کاندھا دیتا رہا اپنے جیتے مُردوں کو
یہ سوچتا تھا کہ اب کیا کروں کہاں جاؤں
بہت سے اور مصائب[1] بھی مجھ پہ ٹوٹ پڑے
میں ڈھونڈنے لگا ہر سمت سچی جھوٹی پناہ
تلاشِ حسن میں، شعر و ادب میں، دوستی میں
رُندھی صدا سے محبت کی بھیک مانگی ہے
نئے سرے سے سمجھنا پڑا ہے دنیا کو
بڑے جتن سے سنبھالا ہے خود کو میں نے ندیم
مجھے سنبھلنے میں چالیس سال گزرے ہیں
مری حیات تو وِش پان[2] کی کتھا ہے ندیم
میں زہر پی کے زمانے کو دے سکا امرت
نہ پوچھ میں نے جو زہرابۂ حیات پیا
کوئی اُتار لے اُن کو تو ہڈیاں اڑ جائیں

[1] والد، بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی موتوں کی طرف اشارہ ہے۔ (فراق)

[2] مہادیو کے زہر پینے کی کتھا۔ (فراق)

مگر ہوں دل سے میں اس کے لئے سپاس گزار
لرزتے ہاتھوں سے دامنِ خلوص نہ چھٹا
بچا کے رکھی تھی میں نے امانتِ طفلی
اُسے نہ چھین سکی مجھ سے دستبردِ شباب
بقول شاعرِ ملکِ فرنگ "ہر بچہ!
خود اپنے عہدِ جوانی کا باپ ہوتا ہے
یہ کم نہیں ہے کہ طفلیٔ رفتہ چھوڑ گئی
دلِ حزیں میں کئی چھوٹے چھوٹے نقشِ قدم
مری انا کی رگوں میں پڑے ہوئے ہیں ابھی
نہ جانے کتنے بہت نرم انگلیوں کے نشاں
ہنوز وقت کے بے درد ہاتھ کر نہ سکے
حیاتِ رفتہ کی زندہ نشانیوں کو فنا
زمانہ چھین سکے گا نہ میری فطرت سے
مری صفا مرے تحت الشعور کی عصمت
تخیلات کی دوشیزگیٔ ردِ عمل
جوان ہو کے بھی بے لوث طفل وشی جذبات

سیانا ہونے پہ بھی یہ جبلّتیں میری
یہ سرخوشی و غمِ بے ریا، یہ قلبِ گداز
بغیر بیر کے ان بن، غرض سے پاک تپاک
غرض سے پاک یہ آنسو، غرض سے پاک ہنسی
یہ دشتِ دہر میں ہمدردیوں کا سرچشمہ
قبولیّت کا یہ جذبہ، یہ کائنات و حیات
اس ارضِ پاک پہ ایمان، یہ ہم آہنگی
ہر آدمی سے، ہر اک خوب و زشت سے یہ لگاؤ
یہ ماں کی گود کا احساس سب مناظر میں
قریب و دور زمیں میں یہ بوئے وطنیت
نظامِ شمس و قمر میں پیامِ حفظِ حیات
بچشمِ شام و سحر مامتا کی شبنم سی
یہ سازِ دل میں مرے نغمہ انا لکونین
ہر اضطراب میں روحِ سکونِ بے پایاں
زمانۂ گزراں میں دوام کا سرگم
یہ بزمِ جشنِ حیات و ممات سجتی ہوئی

کسی کی یاد کی شہنائیاں سی بجتی ہوئی
یہ رمزیت کے عناصر، شعورِ پختہ ہیں
فلک پہ وجد میں لاتی ہے جو فرشتوں کو
وہ شاعری بھی بلوغِ مزاجِ طفلی ہے
یہ نشتریتِ ہستی یہ اس کی شعریت
یہ پتّی پتّی یہ گلزارِ زندگی کے کسی
لطیف نور کی پرچھائیاں سی پڑتی ہوئی
بہم یہ حیرت و مانوسیّت کی سرگوشی
بشر کی ذات کہ مہرِ الوہیت بہ جبیں
ابد کے دل میں جڑیں مارتا ہوا سبزہ
غمِ جہاں مجھے آنکھیں دکھا نہیں سکتا
کہ آنکھیں دیکھے ہوئے ہوں میں اپنے بچپن کی
مرے لہو میں ابھی تک سنائی دیتی ہیں
سکوتِ حسن میں بھی گھنگھروؤں کی جھنکاریں
یہ اور بات کہ میں اس پہ کان دے نہ سکوں
اسی ودیعتِ طفلی کا اب سہارا ہے

یہی ہیں مرہم کافور، دل کے زخموں پر
انھی کو رکھنا ہے محفوظ تا دمِ آخر
زمینِ ہند ہے گہوارہ آج بھی ہمدم
اگر حساب کریں دس کروڑ بچّوں کا
یہ بچے ہند کی سب سے بڑی امانت ہیں
ہر ایک بچّے میں ہیں صد جہانِ امکانات
مگر وطن کا حل عقدہ جن کے ہاتھ میں ہے
نظامِ زندگیٔ ہند جن کے بس میں ہے
رویّہ دیکھ کے ان کا یہ کہنا پڑتا ہے
کسے پڑی ہے کہ سمجھے وہ اس امانت کو
کسے پڑی ہے کہ بچّوں کی زندگی بچائے
خراب ہونے سے، مٹنے سے، سوکھ جانے سے
بچائے کون اِن آزردہ ہونہاروں کو؟
وہ زندگی جسے یہ دے رہے ہیں بھارت کو
کروڑوں بچّوں کے مٹنے کا یہ المیہ ہے
چرائے جاتے ہیں بچّے ابھی گھروں سے یہاں

کہ جسم توڑ دیئے جائیں ان کے تاکہ ملے
چھڑانے والوں کو خیرات ماگھ میلے کی
جو اس عذاب سے بچ جائیں تو گلے میں پڑجائیں
وہ لعنتیں کہ ہمارے کروڑوں بچّوں کی
ندیم خمیر سے مٹّی خراب ہو جائے
وہ مفلسی کہ خوشی چھین لے وہ بے برگی
اُداسیوں سے بھری زندگی کی بے رنگی
وہ یاسیات نہ جس کو چھوئے شعاعِ اُمید
وہ آنکھیں دیکھتی ہیں ہر طرف جو بے نوری
وہ ٹکٹکی کہ جو پتھرا کے رہ گئی ہو ندیم
وہ بے دلی کہ ہنسی چھین لے جو ہونٹوں سے
وہ دکھ کہ جس سے ستاروں کی آنکھ بھر آئے
وہ گندگی، وہ کثافت، مرض زدہ پیکر
وہ بچے چھن گئے ہوں جن سے بچپنے اُن کے
ہمیں نے گھونٹ دیا جن کے بچپنے کا گلا
جو کھاتے پیتے گھروں کے ہیں بچے ان کو بھی کیا

سماج پھولنے پھلنے کے دے سکی سادھن

وہ سانس لیتے ہیں تہذیب کش فضاؤں میں

ہم اُن کو دیتے ہیں بے جان اور غلط تعلیم

ملے گا علم جہالت نما سے کیا اِن کو

نکل کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے

یہ بدنصیب نہ گھر کے نہ گھاٹ کے ہونگے

میں پوچھتا ہوں یہ تعلیم ہے کہ مکّاری

کروڑوں زندگیوں سے یہ بے پناہ دغا

نصاب ایسا کہ محنت کریں اگر اس پر

بجائے علم، جہالت کا اکتساب کریں

یہ الٹا درسِ ادب، یہ سڑی ہوئی تعلیم

دماغ کی ہو غذا یا غذائے جسمانی

ہر اک طرح کی غذا میں یہاں ملاوٹ ہے

وہ جس کو بچّوں کی تعلیم کہہ کے دیتے ہیں

وہ درس الٹی چھری ہے گلے پہ بچپن کے

زمینِ ہند ہنڈولہ نہیں ہے بچّوں کا

کروڑوں بچّوں کا یہ دیس اب جنازہ ہے
ہم انقلاب کے خطروں سے خوب واقف ہیں
کچھ اور روز یہی رہ گئے سیو لیل و نہار
تو مول لینا پڑے گا ہمیں یہ خطرہ بھی
کہ بچّے قوم کی سب سے بڑی امانت ہیں

تقسیمِ دولت

اے اہلِ طرب رنج والم بانٹ رہا ہوں
خوشیاں بھی ہوں قربان وہ غم بانٹ رہا ہوں

اک شعلۂ اعجازِ رقم بانٹ رہا ہوں
ہے نوک پہ جادو قلم بانٹ رہا ہوں

ہے موت سے بھی ساز وہ ہوں زندۂ جاوید
امرت کے اڑیں ہوش وہ سم بانٹ رہا ہوں

چھیڑی وہ غزل میں نے کہ ہیں وجد میں کونین
اور یوں تو کوئی کیفِ نہ کم بانٹ رہا ہوں

ہے مسکنِ آہوئے ختن ہر دلِ پُر کیف
جادو بھری آنکھوں کا بھرم بانٹ رہا ہوں

پڑتی ہیں سرِ عالمِ اسرار کمندیں
لہرائی ہوئی زلف کے خم بانٹ رہا ہوں

افکار مرے چیر گئے سینۂ آفاق
اشعار ہیں یا تیغِ دو دم بانٹ رہا ہوں

اِس پردۂ آواز سے پو پھوٹ رہی ہے
فردا کے جلوسوں کے علم بانٹ رہا ہوں

یہ مہر و وفا کے جو سناتا ہوں ترانے
اے دوست ترے لطف و کرم بانٹ رہا ہوں

کروٹ نئی لیتے ہیں زمانے کے ارادے
دنیا میں نئے قول و قسم بانٹ رہا ہوں

کھاتا ہوں شہنشاہئ جمہور کی سوگند
میں سلطنتِ قیصر و جم بانٹ رہا ہوں

چونکا نہ دیں ایمان کو یہ کفر کے تحفے
بول اٹھنے کو ہیں جو وہ صنم بانٹ رہا ہوں

لیتی ہے مری بات کو کچھ یوں نئی دنیا
جیسے کوئی انمول رقم بانٹ رہا ہوں

اشعار کی یہ چستیٔ بندش ہے بہانہ
اے دوست تری شوخیٔ رم بانٹ رہا ہوں

یہ نغمہ سرائی ہے کہ دولت کی ہے تقسیم
انسان کو انسان کا غم بانٹ رہا ہوں

جس سے مرے وجدان میں پلتے ہیں خیالات
جمہور میں وہ ناز و نعم بانٹ رہا ہوں

انفاسِ خزاں دیدہ کو شعلوں میں بسا کے
ویرانوں کو گلزارِ ارم بانٹ رہا ہوں

پیشانیٔ مستقبلِ انساں ہے منور
وہ شعلے سرِ دیر و حرم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ عرب آؤ ان اشعار کو پرکھو
کچھ سوچ کے میراثِ عجم بانٹ رہا ہوں

معیارِ سخن اس سے چمک جائے تو ہے بات
جس دولتِ افکار کو کم بانٹ رہا ہوں

ہر دیدۂ مشتاق میں شبنم کی جھلک ہے
آنکھوں میں جو پنہاں ہے وہ نم بانٹ رہا ہوں

خلاقِ تمدن ہے یہی نیستیٔ عشق
ہستی کو میں پیغامِ عدم بانٹ رہا ہوں

اشعار ہیں یا گنجِ گراں مایۂ فطرت
نغموں کے وہ دینار و درم بانٹ رہا ہوں

یہ تلخ نوائی مری ضامن ہے بقا کی
جو جانِ کرم ہے وہ ستم بانٹ رہا ہوں

تعمیر کریں گے نئی دنیا، نئی دنیا
مزدوروں میں وہ زورِ ہمم بانٹ رہا ہوں

ہر چیز کا چولا ہی بدل دوں گا سرے سے
سنسار کو ایک اور جنم بانٹ رہا ہوں

دنیا کو نئے دور کی دیتا ہوں بشارت
یا اک نئی تقدیرِ امم بانٹ رہا ہوں

کل جن سے بدلنے کو ہے تقدیر بشر کی
میں آج وہ افکار اہم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ ادب آؤ، یہ جاگیر سنبھالو!
میں مملکتِ لوح و قلم بانٹ رہا ہوں

کھلتا ہی نہیں مجھ پہ فراقؔ اپنی صدا سے
کیا کیا اثرِ شادی و غم بانٹ رہا ہوں

دھرتی سنگیت

دھرتی تو غلا کی رقاصہ، دامن میں لئے ہر دشت و چمن

ہے میرے کلام کی بندش میں دھرتی کا سکوں دھرتی کا چلن

ان نغموں میں ہم دھرتی کا سورج سے بیاہ رچاتے ہیں

اس عقد کا جشن مناتے ہیں یہ چنگ و رباب و رقصِ سخن

شاعر کے خیالوں کی لالی، دھرتی کی دمکتی بندی ہے

ہر کاوشِ پنہاں، دھرتی کے ہے اٹھتے ہوئے گھونگھٹ کی پھبن

بل کھائے ہوئے دریاؤں میں تیری ہی لٹیں ہیں چھٹکی ہوئی

لہرائے ہوئے صحراؤں میں تیرے ہی سلگتے دل کی جلن

خطِ کہسار میں تیرے ہی ابرو کی اُپی تلواریں ہیں

ہر لالہ و گُل میں تیرے ہی لو دیتے ہوئے مکھڑے کی پھبن

دھرتی کا سہاگ دمکتا ہے، اشعار کی شعلہ نوائی میں

جب روحِ نباتات مچلتی ہے، دھرتی کا اُگتا ہے جوبن

ست رنگ شعاعوں کی لرزش تیری ہی آنکھ لگے ڈورے

ندی ساگر میں پڑتے بھنور تیرے ہی رُخ کے چاہ ذقن

سنسار کی مدبھری صبحوں میں تو ہی لیتی ہے انگڑائی

کرنوں کی صبوحی چھلکی ہوئی جس کا ہر گھونٹ خمار شکن

دھرتی کی چمک، دھرتی کی جھلک، دھرتی کی لہک دھرتی کی مہک

صحرا صحرا، دریا دریا، وادی وادی، گلشن گلشن

تو سورج کی وہ کٹی پتلی جو کو کھ بنی تہذیبوں کی

گودی میں پلے ہیں، کھیلے ہیں، ہر علم و عمل، ہر جادوئے فن

دھرتی جس کا ہر افسانہ، افسانہ در افسانہ ہے

اڑ جاتی ہے نیند ستاروں کی، لیتے ہیں جمائی دشت و دمن

دھرتی پر پچھلی راتوں کو میخانۂ غیب اترتے ہیں

ہر صبح بہار پیالہ فگن، ہر لالۂ صحرا صاعقہ زن

گذرے ہیں دھرتی سے ہو کر قرنوں سے قافلۂ ماضی

محفوظ ہیں اس کے سینے میں ناموسِ ازل، آئینِ کہن

خم و پیچ زماں، خم و پیچ مکاں اس رقص سرمدی کے جلوے

یہ سلیقۂ وقت کا زیر و بم، دھرتی کے ہی دل کی ہے دھڑکن

تیرا سورج سے بچھڑنا تھا یا تھی سیتا کی جلا وطنی
ہاں لوکُش کانڈ[1] کہیں جس کو دنیا ہے وہ باب رامائن
تیرے ارمان نکالیں گے ماتا! ہم سورج کے بیٹے
تیرے قدموں میں ڈالیں گے سورج کے مکٹ کے لعل یمن
ہر جُگ میں ہم تو دیتے رہے ہیں تیرے لئے، ہر قربانی
ہر دور میں ہم تو لٹاتے رہے ہیں؟ تیری خاطر تن من دھن
ماتھے پہ بجلیوں کا جھومر، ساگر لہریں، زنجیر کمر
ست رنگ بہاریں گھونگھٹ میں، لہرائی شفق تیرا دامن
تو کو کھ مانگ سے ٹھنڈی رہے تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے
سنتان کی لے گیتا نکلی، ہم ہیں تیرے سنگار ابرن

---

[1] لو اور کُش سیتا کے دو بیٹے تھے۔ رامائن میں لوکُش کانڈ وہ باب ہے جس میں سیتا کی جلا وطنی اور ان کے بیٹوں کی جوانمردی کا حال ہے۔ سیتا زمین سے پیدا ہوئی تھیں اور رام سورج ونشی تھے۔ استعارۃً سیتا اور رام کی کہانی زمین کے سورج سے جدا ہونے اور پھر مل جانے کی کہانی ہے۔ فراق
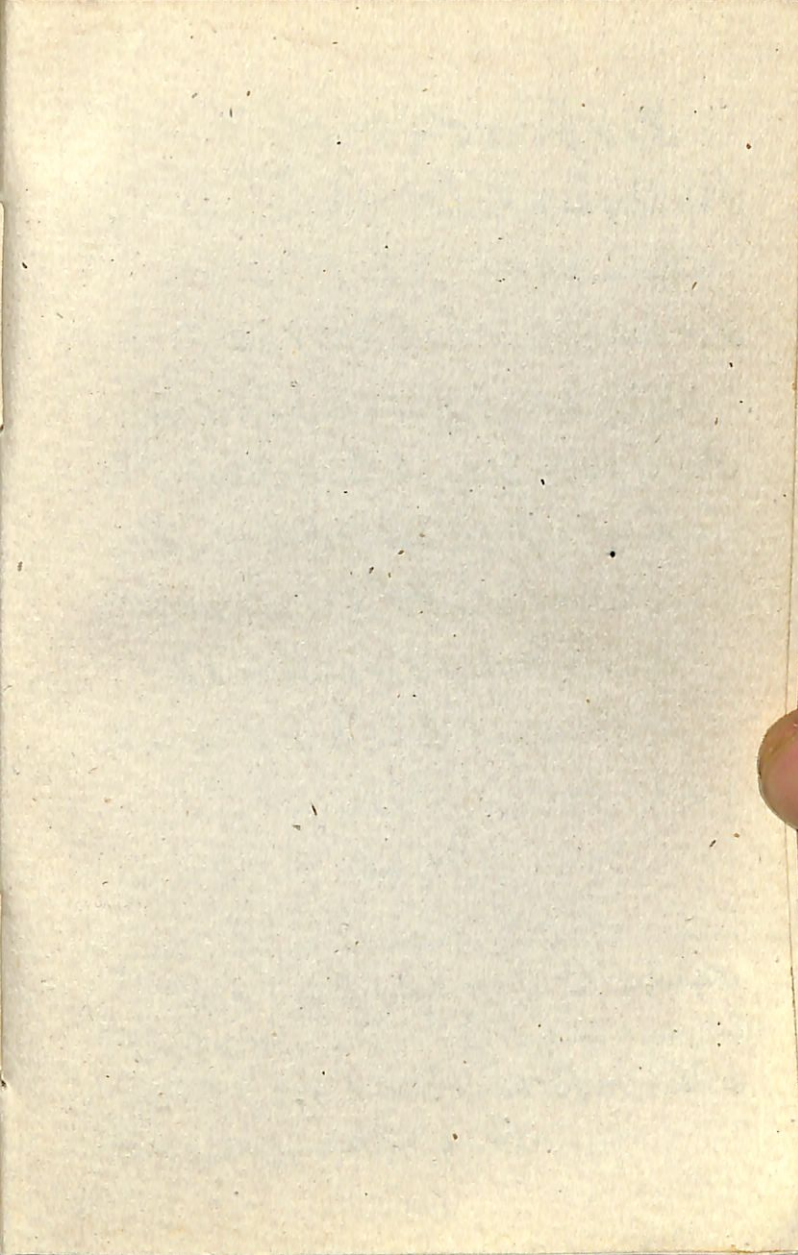
رباعیاں

ہر ایک دریا فراق دریا دریا
ہر ایک صحرا فراق صحرا صحرا
محدود کوئی چیز نہیں عالم میں
ہر ایک دنیا فراق دنیا دنیا

ہم چھان چکے ہیں نا چشیدہ یہ نہیں
کھنچتی ہے دل میں ناکشیدہ یہ نہیں
ہم ہیں آفاق کے ہمارا آفاق
یہ تجربہ ہے کوئی عقیدہ یہ نہیں

ہوں دہریہ ایمان مرا دہریت ہے
حیرت سے بھری دہر کی کیفیت ہے
رمزیت دہر، ماورائے تشریح
رمزیت بس فراق رمزیت ہے

دنیائے دُنی سے جسے نسبت ہی نہیں
وہ میرے تصوّف میں حقیقت ہی نہیں
کہتے ہیں خدا و روح و مذہب جس کو
دجدان کو ان سب کی ضرورت ہی نہیں

ہے عقل و دماغ کی نگاہ بینا
وجدان سے ہو جاتا ہے روشن سینہ
قدرت کے مظاہر کو یہ آئینہ دکھائے
انسان پہ وہ قدرت کو کرے آئینہ

احساس سے ہر پردہ اٹھا دیتا ہے
خود عقل کو وہ اُس کا پتہ دیتا ہے
خود ساختہ جال میں پھنس جاتی ہے عقل
وجدان اسے آگاہ کرا دیتا ہے

آفاق بس آزمائشوں کا تو نہیں
جو ہر جسے کہیے ماشہ تولہ تو نہیں
ہر شے عقل جا پرکھ تو لیتی ہے
لیکن یہ جانچنا پرکھنا تو نہیں

کیا عقل کے بیوپار میں خیر و برکت
بے پایاں بے کراں ہے دل کی دولت
ہے علم اگر خبر تو وجدان نظر
ہشیاری بیچ کر خریدو حیرت

جس وقت کھلا حقیقتوں کا بازار
چل نکلا لین دین کا کاروبار
صرّافے میں عقل کے نہ تھیں اشرفیاں
ہر سمت تھے ریزگاریوں کے انبار

ہیں دہریوں کے بھی تو سجود و رکوع
گر دل میں ترے نظامِ شمسی ہو طلوع
اللہ نہیں یہ کائنات او ناداں
ہے ذکر و فکر کا مناسب موضوع

ہے بہتوں کی عقل اک جیتا مُردہ
دم توڑ گئی خیر سے جس شے کو چھُوا
آفاق نمودِ زیست سے پہلے بھی
اک زندہ نظام تھا جنابِ والا

زندہ آفاق کے حقائقِ اعلیٰ
سانچے میں موت کے ہر اک کو ڈھالا
وہ عقل ہی کیا جیسے ہو سوکھے کا روگ
وجدان دے مجھ کو خونِ صالح والا

ہے اس میں شخصیت کا یکسر نقصان
اک رگ ہو جاں دار اک رگ ہو بیجان
ان سے ملتا ہے علم بے رس جس کا
عقل حساس اور بے حس وجدان

شاداب ازل ہے یہ بیابان نہیں
رہتی دنیا فراق ویران نہیں
احساسِ وطن تصورِ دہر سے ہو
یہ درکِ کائنات آسان نہیں

یکطرفہ شخصیت کے سارے ہیں فتور
یہ سب ہے نقشِ نامکمل کا قصور
عقل و وجدان میں تصادم نہ رہے
ہو خود سے ہم آہنگ ترا نظم و شعور

خود عقل کی آنکھ جس سے بھر آتی ہے
رنگت رُخِ دہر کی نکھر آتی ہے
وجدان کی روشنی ہے یا صبحِ بہار
دنیا کتنی حسین نظر آتی ہے

اے عقل ہے اگرچہ صاف تیری نیّت
دیتی ہے ہمیں حقیقتوں کی دولت
وجدان بٹائے نہ اگر تیرا ہاتھ
ہرگز ترے ہاتھ میں نہ آئے برکت

تحقیق و تجسّس میں رہے تو دن رات
احساسِ جمال بھی تو ہے جزوِ حیات
گھاٹے میں رہے گا تو یہ سوداگر کے
حیرت نہ بیچ کر نہ لے معلومات

اس طرح تو دنیا کا سمجھنا ہے محال
تشریح سے کب کھلا مظاہر کا حال
یکطرفہ خرد کاش اِدھر بھی دیکھے
اس جانب جزئیات، اس سمت اجمال

دیتی ہے خرد مشاہدوں کو ترتیب
کرتا ہے عشق اُن سے پھر ہم کو قریب
اِک قدرِ مشترک ہے وہ دونوں میں
کہتے ہیں اسی کو ارتقائے تہذیب

وجدانِ جمالیات کی تھی جو کمی
مردہ کثرت میں زندہ وحدت نہ ملی
گو عقل نے بے شمار تحقیقیں دیں
اربوں اعداد سے اِکائی نہ بنی

کہتے ہیں کہ جیسے کو ملا ہے تیسا
داد ایسی ملی شعر کہا تھا جیسا
احمق ہے جو کہے عقل کو جو ناکافی
ہم عقل سے محروم ہیں — اچھا! ایسا؟

اے دوست! سمجھ حیاتِ انساں کے رموز
کیا پوچھ رہا ہے مجھ سے یزداں کے رموز
ہے اصلِ حقیقت ارتقائے تہذیب
وہ عشق و عمل میں ربطِ پنہاں کے رموز

اب ایک بیابان ہے شاداب وجود
اسباب و علل کی خاک اڑائیں بے سود
دھندلی پڑ جائے گی جگمگاتی دنیا
اتنے نہ ہوں احساس ترے گرد آلود

وہ ہستی کائنات لیتی ہوئی لہر
اب خاک اڑا رہی ہے کیسا ہوا قہر
ہستی کو کیا عقل نے دشتِ ویراں
اس صحرا سے نکال وجدان کی نہر

ہستی کا محال جائزہ اور حساب
نادان! ستّر ہزار حائل ہیں حجاب
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں
پیدا کر لے نگاہ میں استعجاب

حیرت کدہ بن کے اور کڑھ جاتی ہے
دنیا نظروں میں اور چڑھ جاتی ہے
ہوتی ہے جب اس کی خوابناکی معلوم
اصلیّتِ دہر اور بڑھ جاتی ہے

زنجیرِ حقیقتوں کی لہراتی ہے
جھنکار کی پُر رمز صدا آتی ہے
حیرت سے عقل آنکھ جھپکاتی ہے
ایسے میں دل کی آنکھ کھُل جاتی ہے

سب دیکھ کے کچھ بھی تو نہ دیکھا افسوس
سب جان کے کچھ بھی تو نہ جانا افسوس
ہستی سے ہو سکے گا کیا تو مانوس
مانوس کو معجزہ نہ سمجھا افسوس

اس دن سے ہوا علم میں گڑ بڑ گھاتا
کیا فیضِ صحبت اس سے عالم پاتا
جب عقل سمجھ بیٹھی ہے خود کو کافی
وجدان سے قطع کر کے رشتہ ناتا

عقل و وجدان کی وہ انتہا پائی
خود سے ہر ایک صلاحیت ٹکرائی
اس جنگ میں وجدان کے کام آنیکے بعد
ہے کتنی ڈراؤنی عقل کی تنہائی

تشریحِ حیات و اصطلاحاتِ ممات
دن کا کب بن سکی ہے آئینہ رات
ابلی پڑتی ہے زندگی رگ رگ میں
اقلیدس کی نہیں ہے اشکالِ حیات

منطق کی مدد سے رازِ پنہاں معلوم
از نفسیات رازِ انساں معلوم
ہے عقل کی خوردبین ہر ہستی پر
اس تجزیہ سے علمِ گلستاں معلوم

ہر کاہ سے صد درسِ نمو لیتا ہوں
ہر ماہ سے صد جام و سبو لیتا ہوں
کہ دمہ کی رگ برون پہ نشتر بے سود
کہ دمہ کی رگِ درون کو چھو لیتا ہوں

وہ ہے وجدان کل کو جو پہچانے
تجزیہ و عمل کا ہنر جانے
سولہ آنوں کا روپیہ ہوتا ہے
یا ہوتے ہیں روپے میں سولہ آنے

بیداریٔ بے کراں وجدان کے خواب
چہروں سے حقیقتوں کے اٹھتے ہیں نقاب
بس مسجد تک فراق ملّا کی دوڑ
جولانگہِ عقل تجربوں کی محراب

پیمائش و تقسیم و ہیولیٰ تو نہیں
دنیا کا احتساب، دینا تو نہیں
ہر شے کو عقل ناپ تو لیتی ہے
لیکن ناپنا سمجھنا تو نہیں

اجزائے جہاں کو سمجھ اصل جہاں
محدود نہیں ہے دہر کی رُوحِ رواں
ہر چیز جسے کہتے ہیں آنی جانی
ہے واقعوں کا سلسلۂ بے پایاں

مسدود کئے بغیر کیونکر سمجھے
معدود کئے بغیر کیونکر سمجھے
بے پایاں بے شمار جلوے انہیں عقل
محدود کئے بغیر کیونکر سمجھے

عقل اپنا اثر ڈالتی ہے ہر شے پر
وجدان براہِ راست لیتا ہے اثر
عقل و وجدان دونوں لیتے ہیں علم
وہ علمِ عرض تو یہ علمِ جوہر

دار الصحت ہے اسکو وجداں کا دیار
اس آب وہوا میں دیکھ ہستی کا نکھار
ہے عقل کے اسپتال میں جبتک زیست
چہرے پہ آب و رنگ آنا دشوار

جاگ اٹھے گی روح تم سو جاؤ گے
سرچشمۂ زندگی میں دھو جاؤ گے
کھو جاؤ گے جب مناظرِ قدرت میں
تو خود سے بہت قریب ہو جاؤ گے

محفل میں پہنچ کے حُسنِ محفل بھی تو دیکھ
منزل پہ پہنچ کے حُسنِ منزل بھی تو دیکھ
تو پیر گئی ہے بحرِ ہستی اے عقل!
ساحل پہ پہنچ کے حُسنِ ساحل بھی تو دیکھ

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے؟
دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے؟
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ
سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے؟

نیا کلام

غزلیات

میں ہوش عنادل ہوں مشکل ہے سنبھل جانا
اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا
تقدیرِ محبّت ہوں مشکل ہے بدل جانا
سو بار سنبھل کر بھی معلوم سنبھل جانا
اس آنکھ کی مستی ہوں اے بادہ کشو جسکا
اُٹھ کر سرِ میخانہ ممکن ہے بدل جانا
ایامِ بہاراں میں دیوانوں کے تیور بھی
جس سمت نظر اٹھی عالم کا بدل جانا
گھنگھور گھٹاؤں میں، سرشار فضاؤں میں،
مخمور ہواؤں میں، مشکل ہے سنبھل جانا
ہوں لغزشِ مستانہ میخانہ عالم میں
برقِ نگہِ ساقی کچھ بچ کے نکل جانا

اِس گلشنِ ہستی میں کم کھلتے ہیں گُل ایسے
دنیا مہک اٹھے گی تم دل کو مسل جانا

میں سازِ حقیقت ہوں سویا ہوا نغمہ تھا
تھا رازِ نہاں کوئی پردوں سے نکل جانا

ہوں نکہتِ مستانہ گلزارِ محبّت میں
مدہوشئ عالم ہے پہلو کا بدل جانا

مستی میں لگاوٹ سے اس آنکھ کا یہ کہنا
میخوار کی نیّت ہوں ممکن ہے بدل جانا

جو طرزِ غزل کوئی مومنؔ نے طرح کی تھی
صد حیف فراقؔ اس کا صد حیف بدل جانا

دیدنی ہے نرگسِ خاموش کا طرزِ خطاب
گہ سوال اندر سوال و گہ جواب اندر جواب

جوہرِ شمشیرِ قاتل ہے کہ ہیں رگہائے ناب
ساقیا تلوار کھنچتی ہے کہ کھنچتی ہے شراب

عشق کے آغوش میں بس اِک دلِ خانہ خراب
حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب

سرورِ کفّار ہے عشق اور امیرالمومنین
کعبہ و تبخانہ اوقافِ دلِ عالی جناب

راز کے صیغے میں رکھا تھا مشیّت نے جنھیں
وہ حقائق ہو گئے میری غزل میں بے نقاب

ایک گنجِ بے بہا ہے اہلِ دل کو ان کی یاد
تیرے جورِ بے نہایت تیرے جورِ بے حساب

آدمیوں سے بھری ہے یہ بھری دنیا مگر
آدمی کو آدمی ہوتا نہیں ہے دستیاب

عشق کی سرمستیوں کا کیا ہوا اندازہ کہ عشق
صد شراب اندر شراب اندر شراب اندر شراب

راس آیا دہر کو خونِ جگر سے سینچنا
چہرۂ آفاق پر کچھ آچلی ہے آب و تاب

اب اسے کچھ اور کہتے ہیں کہ حسنِ اتفاق
اک نظر اٹھتی ہوئی سی کر گئی مجھ کو خراب

ایک سناٹا اٹوٹ اکثر اور اکثر اے ندیم
دل کی ہر دھڑکن میں صد زیر و بم چنگ و رباب

اے فراق آفاق ہے کوئی طلسم اندر طلسم
ہے ہر اک خواب اک حقیقت ہر حقیقت ایک خواب

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میر سناؤ بڑی اداس ہے رات

نوائے درد میں اک زندگی تو ہوتی ہے
نوائے درد اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات

اداسیوں کے جو ہمراز و ہم نفس تھے کبھی
انھیں نہ دل سے بھلاؤ بڑی اداس ہے رات

جو ہو سکے تو ادھر کی بھی راہ بھول پڑو
صنم کدہ کی ہواؤ بڑی اداس ہے رات

کہیں نہ تم سے تو پھر اور جا کے کس سے کہیں
سیاہ زلف کے سایو بڑی اداس ہے رات

پڑا ہے سایۂ غم جب حیاتِ انساں پر
وہ داستاں بھی سناؤ بڑی اداس ہے رات

ابھی تو ذکرِ سحر دوستو ہے دور کی بات
ابھی تو دیکھتے جاؤ بڑی اداس ہے رات

سنا ہے پہلے بھی ایسے میں بجھ گئے ہیں چراغ
دلوں کی خیر مناؤ بڑی اداس ہے رات

دیئے رہو یوں ہی کچھ دیر ہاتھ میں ہاتھ
ابھی نہ پاس سے جاؤ بڑی اداس ہے رات

کوئی شمار بھی رکھتی ہیں ظلمتوں کی تہیں!
بتاؤ غم کی گھٹاؤ بڑی اداس ہے رات

کوئی کہو یہ خیالوں سے اور خوابوں سے
دلوں سے دور نہ جاؤ بڑی اداس ہے رات

کرو جو عذر تو رد و قبول یکساں ہے
دلوں نے نکلی دعاؤ بڑی اداس ہے رات

یگانگی ہو کہ دیوانگی ہو سب دھوکہ
سنو سب اپنے پرایو بڑی اداس ہے رات

سمیٹ لو کہ بڑے کام کی ہے دولتِ غم
اسے نہ یوں ہی گنواؤ بڑی اداس ہے رات

بسے ہوئے ہیں کسی کے جو لمسِ رنگیں سے
وہ بستر پہ نہ لگاؤ بڑی اداس ہے رات

اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیئے ہیں ٹوٹے ہوئے
انھیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات

لئے ہوئے ہیں جو بیتے غموں کے افسانے
وہ زندگی ہی بلاؤ بڑی اداس ہے رات

بھرم نشاط و طرب کے نہ اور کھل جائیں
مئے و ایاغ بڑھاؤ بڑی اداس ہے رات

دو آتشہ نہ بنا دے اسے نوائے فراق
یہ سازِ غم نہ سناؤ بڑی اداس ہے رات

زلفِ سیہ ختن ختن — جلوۂ رخ چمن چمن
ہائے یہ شوخیٔ سخن — بات میں بات کن میں کن
پوچھ ضمیرِ عشق سے — رازِ خدا و اہرمن
ہر شبِ غم گذر گئی — اوڑھے ستاروں کا کفن
یاد نہیں کہ کب ہوا — نشّہ سرخوشی ہرن
خود ہی ہے داستانِ شوق — تیرا جمالِ بے سخن
سب ہے کرشمۂ انا — کھا نہ فریبِ ما و من
جلوے نہیں یہ چہرے ہیں — تو ہے خود ہی ایک انجمن
شعر سے بھی لطیف تر — اس کی نزاکتِ بدن
ہے شبِ میکدہ کی جان — نرگسِ صد پیالہ زن
آنکھ طلسمِ شام ہے — یا کوئی آہوئے ختن
مستیٔ عشق سربسر — نشۂ بادۂ کہن
مذہب و ملّت و نظام — بدلیں گے یہ زمن زمن
عشق ہوا اور بدگماں — روٹھ کے اس ادا سے من
ہے یہ خطابِ ناز یا — اڑتے ہیں برگِ یاسمن

تیرے خرامِ ناز میں ٹھنڈی ہواؤں کا چلن
خوشبوئیں جیسے مسکرائیں پوچھ نہ نازکی بہ تن
جیسے فضا پچھاڑیں کھائے ہائے یہ بوئے پیرہن
کس کے یہ عضو عضو سے آتی ہے خوشبوئے دہن
اس کے سکوتِ ناز میں ماجرا ہائے نلدمن
کرشن کی بانسری سے دیکھ سطحِ چمن شکن شکن
میں ہوں فراقؔ خود ہی لاکھ
انجمنوں کی انجمن

ساقیا گنگ و جمن اپنے ہیں کوثر اپنا
جس کو کہتے ہیں دو عالم وہ ہے منظر اپنا
دیکھتے دیکھتے انسان بدل جاتا ہے۔
تھا کسی عہد میں ایک شوخ ستمگر اپنا۔
مفت بھی بِک کے ترے ہاتھ نہ گھاٹے میں رہے
کوئی کرتا نہیں نقصان سراسر اپنا

صحبتیں میری تیری فطرتِ ثانی بن جائیں
کیا کروں میں کہ بنالوں تجھے خوگر اپنا

عشق کو زلف کے افعی نے جہاں کاٹا تھا
لب نے مارا ہے وہیں پھونک کے منتر اپنا

وقت بے وقت نہ آنا صبح نادا میرے پاس
اپنے گھر کو تو سمجھنے دے مجھے گھر اپنا

میرا اخلاق نہیں خوفِ خدا کا ممنون
ہے کسی کا جو مجھے ڈر تو وہ ہے ڈر اپنا

چھوڑ دیں سب مجھے ایسی تو کوئی بات نہیں
بیکسی اپنی غم اپنا دلِ مضطر اپنا

اب زمانہ کی ہوا ان کو جہاں لیجائے
کشتیاں آج اٹھاتے کو ہیں لنگر اپنا

سج کے نکلی ہے مہِ نو سے یہ تاروں بھری رات
آپ بھی زیرِ کمر لیجئے خنجر اپنا

رند کیا تجھکو ریاکار کہیں گے اے شیخ
حال ہر شخص کو معلوم ہے بہتر اپنا

یاد کر لیتے ہیں ایک راندۂ درگاہ کو لوگ
ذکر رہتا ہے کسی بزم میں اکثر اپنا

بُت تراشی تیری ہر بات ہے اے شیخ حرم
دیکھ کعبہ بھی رکھتا ہے اک آذر اپنا

کچھ ہوا اس دلِ غمگیں کو تو ہم رو لینگے
کر نہ اے زلفِ دوتا حال تو ابتر اپنا

کاٹ دی عمر پرستاریٔ گلشن میں فراق
نہ ہوا پر نہ ہوا ایک گلِ تر اپنا

سزائے حسن پرستی بجا، بجا بھی نہیں
کہ جرم عشقِ بتاں ہے برا، برا بھی نہیں

کسی کو کیا نہ ملا زندگی میں وائے نصیب
ہمارے ہاتھ بس ایک دل رہا، رہا بھی نہیں

لٹے لٹے بھی ہیں ہم لوگ کھوئے کھوئے بھی
کہ ہوش غمزدگاں ہے بجا، بجا بھی نہیں

اُسے خدا تو امیروں کا ہے، خدا واعظ
جسے غریبوں کا کہیے خدا، خدا بھی نہیں

ادھر قدم بھی اٹھانے دے بدماغیٔ عشق
ہم ایسوں پر درِ جنّت کھلا، کھلا بھی نہیں

نظر فریبیٔ تحریر لے اڑی مجھ کو
سرے سے نامۂ جاناں پڑھا، پڑھا بھی نہیں

تمام شوخیٔ رفتار تیری راہ گذر
قدم کا نقش کچھ ایسا اٹھا، اٹھا بھی نہیں

وہ جیسے ہے ہی نہیں اس ادا سے سامنے ہے
اگر کہوں کہ وہ مجھ سے خفا، خفا بھی نہیں

ٹھہر گئے سرِ دنیا تو بے جگہ ٹھہرے
چلو چلو کہ یہ ماتم سرا، سرا بھی نہیں

ادا، ادا سے ادا ہو تو ہم ادا سمجھیں
نہیں ادا در ادا جو ادا، ادا بھی نہیں

ہم اس کو دیکھ کے بھی آہ کس طرح دیکھیں
نظارۂ رُخِ جاناں ہوا، ہوا بھی نہیں

عجب یہ دور ہے یارب کہ خوش جمالوں کو
وفا، وفا بھی نہیں ہے، جفا جفا بھی نہیں

بھلا ہے کون، برا کون اس زمانے میں
برا، برا بھی نہیں ہے بھلا، بھلا بھی نہیں

یہ وقتِ صبحِ چمن آنسوؤں کی دنیا میں
سرشکِ خندۂ گل میں چھپا، چھپا بھی نہیں

نگاہِ ناز سے کیا سن کے دل اداس ہوا
اگر کہیں کہ کچھ اس نے کہا، کہا بھی نہیں

چمک اسی کی تب و تابِ حسن و عشق میں ہے
زمیں کا درد کچھ اتنا دبا، دبا بھی نہیں

زمیں مکاں کا یہ پردہ حجابِ اکبر ہے
ہزار بار یہ پردہ اٹھا، اٹھا بھی نہیں

تری نگاہ سے دنیا کو اک شکایت ہے
بجا، بجا یہ شکایت بجا، بجا بھی نہیں

بس اِک نگاہ کی یہ چھائیاں بقا و فنا
بقا، بقا بھی نہیں ہے فنا، فنا بھی نہیں

جسے معاملۂ حسن و عشق کہتے ہیں!!
ہزار بار یہ جھگڑا چکا، چکا بھی نہیں
وہ آنکھ کہتی ہے ایسے کا کیا ٹھکانہ ہے
فراقؔ آدمی تو ہے بھلا، بھلا بھی نہیں

ڈرتا ہوں کامیابیٔ تقدیر دیکھ کر
یعنی ستم ظریفیٔ تقدیر دیکھ کر

قالب میں روح پھونک دی بار ہا بھر بھر آیا
میں مر گیا حیات کی تصویر دیکھ کر

خوابِ عدم سے جاگتے ہی جی پہ بن گئی
زہرابۂ حیات کی تاثیر دیکھ کر

یہ بھی ہوا ہے اپنے تصور میں ہو کے محو
میں رہ گیا ہوں آپ کی تصویر دیکھ کر

سب مرحلے حیات کے طے کر کے اب فراقؔ
بیٹھا ہوا ہوں موت میں تاخیر دیکھ کر

پرچھائیاں

(۱)

یہ شام اِک آئینۂ نیلگوں، یہ نم، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک، کھیت، باغ، دریا، گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے، کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں
قریب و دور یہ گودھول[1] کی ابھرتی گھٹائیں
یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا، روزِ گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی فضا ہے، گھلا گھلا سا فلک

---

[1] گودھول۔ چراگاہوں سے پلٹتے ہوئے مویشی کی چالوں سے اڑتی ہوئی دھول۔

(۲)

یہ چاندنی، یہ ہوائیں، یہ شاخِ گل کی لچک
یہ دورِ بادہ، یہ سازِ خموشِ فطرت کے
سنائی دینے لگی جگمگاتے سینوں میں
دلوں کے نازک و شفّاف آبگینوں میں
ترے خیال کی پڑتی ہوئی کرن کی کھنک

(۳)

یہ رات، چھنتی ہواؤں کی سوندھی سوندھی مہک
یہ کھیت کرتی ہوئی چاندنی کی نرم دمک
سگندھ رات کی رانی[1] کی جب مچلتی ہے
فضا میں روحِ طرب کروٹیں بدلتی ہے
یہ رُوپ سر سے قدم تک حسین جیسے گناہ
یہ عارضوں کی دمک، یہ فسونِ چشمِ سیاہ

---

[1] رات کی رانی یا رات رانی ایک خوشبودار پودے کا نام جس کے پھول رات کو کھلتے ہیں اور بہت نرم خوشبو دیتے ہیں۔

یہ دھج نہ دے جو اجنتا کی صنعتوں کو پناہ
یہ سبینہ پڑہی گئی دیو لوک[1] کی سبھی نگاہ
یہ زمین ہے آکاش کی پرستش گاہ
اتارتے ہیں تری آرتی ستارہ و ماہ
سجل بدن کی ہیاں کس طرح ہو کیفیت
سرسوتی[2] کے بجاتے ہوئے ستار کی گت
جمالِ یار ترے گلستاں کی رہ رہ کے
جبینِ ناز تری کہکشاں کی رہ رہ کے
دلوں میں آئینہ در آئینہ سہانی جھلک

(۴)

یہ چھب، یہ روپ، یہ جوبن، یہ سج، یہ دھج، یہ لہک
چمکتے تاروں کی کرنوں کی نرم نرم پھوار
یہ رسمساتے بدن کا اٹھان اور یہ ابھار

[1] دیو لوک۔ دیوتاؤں کی دنیا۔ عالمِ قدس۔
[2] سرسوتی تلفظ سرس (تی) علوم فنون کی دیوی

یہ بے قرار یہ بے اختیار جوشِ نمود
کہ جیسے نور کا فوارہ ہو شفق آلود
یہ جلوے پیکرِ شب تاب کے یہ بزمِ شہود
یہ مستیاں کہ مئے صاف و درد سب بے سود
خجل ہو لعلِ یمن عضو عضو کی وہ ڈلک

(۵)

بس اِک ستارۂ شنگرف کی جبیں پہ جھمک
وہ چال جس سے لبالب گلابیاں چھلکیں
سکوں نما خمِ ابرو یہ ادھ کھلیں پلکیں
ہر اک نگاہ سے ایمن کی بجلیاں لپکیں
یہ آنکھ جس میں کئی آسماں دکھائی پڑیں
اڑا دیں ہوش وہ کانوں کی سادہ سادہ لویں
گھٹائیں وجد میں آئیں یہ گیسوؤں کی لٹک

(۶)

یہ کیف و رنگِ نظارہ یہ بجلیوں کی لپک
کہ جیسے کرشن سے رادھا کی آنکھ اشارے کرے
وہ شوخ اشارے کہ ربّانیت بھی جائے جھپک
جمال سر سے قدم تک تمام شعلہ ہے
مگر وہ شعلہ کہ آنکھوں میں ڈال دے ٹھنڈک

(۷)

یہ رات انیندا میں ڈوبے ہوئے سے ہیں دیپک
فضا میں بجھ گئے اڑ اڑ کے جگنوؤں کے شرار
کچھ اور تاروں کی آنکھوں کا بڑھ چلا ہے خمار
فسردہ چھٹکی ہوئی چاندنی کا دھندلا غبار
یہ بھیگی بھیگی، اداہٹ، یہ بھیگا بھیگا نور
کہ جیسے چشمۂ ظلمات میں جلے کافور
یہ ڈھلتی رات ستاروں کے قلب کا یہ گداز
خنک فضا میں ترا شبنمی تبسّمِ ناز

جھلک جمال کی تعبیرِ خواب آئینہ ساز
جہاں سے جسم کو دیکھیں تمام ناز و نیاز
جہاں نگاہ ٹھہر جائے راز اندر راز
سکوتِ نیم شبی لہلہے بدن کا نکھار
کہ جیسے نیند کی وادی میں جاگتا سنسار
یہ بزمِ ماہ کی پرچھائیوں کی بستی ہے
فضا کی اوٹ سے وہ خامشی برستی ہے
کہ بوند بوند سے پیدا ہو گوشِ دل میں کھنک

(۸)

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
ہوائیں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروڑوں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات! یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

تضمینات (قلمبندی)

وہ جگمگاتی شعاعیں نگاہِ جاناں کی
فضا میں آتشِ سیّال سی چھلکتی ہوئی
دلوں میں رقص کناں آیتِ حیات اتری
"کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امید واروں میں کل موت بھی نظر آئی"

کوئی کسی کی بات نہ پوچھے اس دنیا کی ریت یہی ہے
ایکدوسرے سے بیگانہ، جہاں جاؤ نفسی نفسی ہے
جس درِ دل کو کھڑکائیں گے، دیکھیں گے زنجیر لگی ہے
"سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
اے دلِ غمگیں! تیری کہانی کون سنے گا کس کو سنائیں؟"

ہم وقت کے سینے میں اِک شمع جلا جائیں
سوئی ہوئی راہوں کے ذرّوں کو جگا جائیں
کچھ رنگ اُڑا جائیں، کچھ رنگ جما جائیں
اس دشت کو نغموں سے گلزار بنا جائیں
"جس سمت سے گزریں ہم کچھ پھول کھلا جائیں"

اُردو شاعری میں فراق اپنی ایک نمائندہ اور منفرد شخصیت کے مالک ہیں اور جہاں تک اُن کی ادبی اور شاعرانہ خوبیوں اور صلاحیتوں کا تعلق ہے، — کوئی دوسرا اُنکے مقابلے کا نظر نہیں آتا۔ اُن کی شاعری بلاشبہ زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے! اُن کے نغمے بار بار گنگنائے جائیں گے، کیونکہ ان میں بے پناہ رس جس، رنگینی، لذت اور لطافت ہے اور اس لئے ان کے نغمے سدابہار اور سدا سہاگ رہیں گے۔

نغمہ نما شاعر جمال فراق کے بہترین کلام کا انتخاب ہے۔ اس میں ان کی نمائندہ شاعری جو غزلوں، نظموں اور رباعیوں پر مبنی ہے، یکجا کردی گئی ہے —

سٹار پاکٹ بکس